فرقہ واریت

اور

فرقہ وارانہ فسادات

تجزیاتی مطالعہ

اصغر علی انجینیر

کتاب کا نام ———— فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ فسادات

مصنف ———— اصغر علی انجینیر

تعداد اشاعت ———— ایک ہزار

سنِ اشاعت ———— ۱۹۸۴ء

قیمت ———— تیس روپے 30/-

قیمت مجلد ———— پینتیس روپے 35/-

پبلشر ———— اسماعیل عطر والا نے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
آرین کاٹیج، نورتھ روڈ، سانتا کروز ایسٹ بمبئی ۴۰۰۰۵۵
کی طرف سے شائع کیا۔

مطبوعہ:۔

جے کے آفسٹ پرنٹرز دھلی ۶

فہرست مضامین

پیش لفظ

لیجئے فرقہ واریت سے متعلق یہ چند مضامین حاضر ہیں۔ پہلے دو مضامین فرقہ واریت کی نظریاتی بنیادوں سے بحث کرتے ہیں۔ آزاد ہندوستان میں فرقہ واریت کی نظریاتی بنیادوں میں یقیناً تبدیلی ہوتی ہے اور معاشی تبدیلیوں نے نئے معاشی اور سماجی عوامل کو جنم دیا ہے۔ ان نئے عوامل کا جائزہ لینا بے حد ضروری ہے۔ ہم نے موقع واردات پر جا کر کئی فرقہ وارانہ فسادات کی تحقیقات کی ہیں اور اِس کتاب میں ہم نے ان تحقیقاتی رپورٹوں کو بھی شامل کیا ہے تاکہ نظریاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ فرقہ واریت کے عملی پہلو بھی قارئین کے سامنے آ جائیں۔

آج کے حالات میں فرقہ واریت کا زہر بڑی تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب ہم فرقہ واریت کی بنیادی وجوہات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ فرقہ واریت محض ہندو مسلم تصادم کا ہی نام نہیں ہے۔ آج جدید ہندوستان میں اور فرقوں کے درمیان بھی تصادم ہو رہا ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان تصادم اس کی تازہ ترین شکل ہے۔ اسی لئے خالصتان پر بھی ہم نے اس کتاب میں ایک مضمون شامل کیا ہے۔ سیلون میں تامل اقلیت میں ہیں اور ان کے ساتھ حال ہی میں جو واقعات پیش آئے وہ بھی اقلیت کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس لئے اس مسئلے پر بھی ہم نے قلم اٹھایا ہے اور اسے اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

چوں کہ مضامین الگ الگ مواقع پر لکھے گئے ہیں اس لئے کئی باتیں ان میں دہرائی

ہوئی ملیں گی۔ مضامین کے مجموعے میں ایک حد تک یہ بات ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مجھے امید ہے قارئین اسے برداشت کریں گے۔ اگر ان مضامین سے فرقہ واریت کو سمجھنے اور اس کا مقابلہ کرنے میں قارئین کو مدد ملی تو میری محنت بار آور ہو گی۔

اصغر علی انجینئر

۲۰/۱۰/۸۳

فرقہ وارانہ فسادات کا نظریاتی پس منظر

میں نے اور دیگر لوگوں نے فرقہ وارانہ فسادات کی جائے وقوع پر تحقیقات کی ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات آئے دن ہوتے رہتے ہیں اور ملک کے حالات سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں ہمارے نہ چاہتے ہوئے بھی ہوتے رہیں گے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ہم اپنے ملک کے مستقبل سے مایوس ہیں لیکن ایک ماہر سماجیات (SOCIAL SCIENTIST) کو حقائق کے پیشِ نظر اور خصوصًا تجرباتی (EMPIRICAL) حقائق کے پیشِ نظر اپنی بات کہنا ہوتی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی تحقیقات کے دوران جو تجرباتی حقائق ہمارے سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں ان فسادات سے متعلق ایک ہمہ گیر نظریہ وضع کرنا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پہلے بھی اس قسم کی کوششیں ہوئی ہیں۔ لیکن پچھلے ۱۵ سالوں میں فرقہ وارانہ فسادات نے جو نوعیت اختیار کی ہے، اس کے پیشِ نظر ہمیں ان نئے حقائق کا بھی جائزہ لینا ہوگا جو ان فسادات کے دوران اُبھر کر ہمارے سامنے آئے ہیں کوئی بھی نظریہ وضع کرنے سے قبل یہاں ایک بات کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے کہ ہر فساد کے کچھ اپنے مخصوص عناصر ہوتے ہیں جو دوسرے کسی فساد پر لاگو نہیں ہوتے اس لئے کوئی بھی نظریہ، وہ چاہے کتنا ہی ہمہ گیر کیوں نہ ہو، ہر فساد پر پوری طرح لاگو نہیں ہوسکتا ان مخصوص عناصر کا اپنا رول ہوتا ہے اور کسی بھی فساد کی تعلیلی کڑیوں (CAUSAL CHAIN) کو سمجھنے کے لئے ان عناصر کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔

پہلے عام طور پر فرقہ وارانہ فسادات کا سارا الزام "برطانوی سامراج کی لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر ڈالا جاتا تھا یا اس بات پر کہ سامراج داد ہماری معیشت کو ترقی دینے میں حائل ہے

اور ترقی کے مواقع محدود ہونے کی وجہ سے آپس میں لڑائی ہوتی ہے اور فرقہ وارانہ منافرت پیدا ہوتی ہے۔ برطانوی دور میں بڑی حد تک یہ نظریہ صحیح تھا اور آج بھی کچھ حد تک صحیح ہو سکتا ہے لیکن یہ نظریہ آج کے فسادات کی نوعیت سمجھنے کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔

آج فرقہ وارانہ تشدد کو سمجھنے کے لئے ہمیں جدید ہندوستان میں ہو رہی معاشی ترقی اور سماجی تبدیلی کی حرکیات کو مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ کوئی بھی نظریہ ان باتوں کو نظر انداز کر کے فرقہ وارانہ یا ذات پات کی بنیاد پر ہو رہے تشدد کو صحیح تناظر میں نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن آج بھی عام طور پر اس سلسلے میں ایک طرف برطانوی پالیسیوں پر زور دیا جاتا ہے اور دوسری طرف مسلم دور کی تاریخ کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔ یہ باتیں، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، حالانکہ بالکل غلط نہیں ہیں، لیکن یہ آج ہونے والے فسادات پر پوری طرح روشنی نہیں ڈال پاتیں۔ میں تو اس سے بھی ایک قدم آگے جا کر یہ کہوں گا کہ ہمیں سماجی۔ معاشی تبدیلیوں کے پیشِ نظر، مختلف سیاسی جماعتوں کے رول کا بھی، جو اپنے آپ کو نظریاتی اعتبار سے سیکولر قرار دیتی ہیں، دوبارہ جائزہ لینا پڑے گا۔ آج کے تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات میں فرقہ وارانہ تشدد کی ذمہ داری محض آر ایس ایس اور جماعتِ اسلامی جیسی روایتی فرقہ پرست جماعتوں پر ڈال دینے سے کام نہیں چلے گا۔ میں یہ ہرگز نہیں کہنا چاہتا کہ ان جماعتوں کا فرقہ وارانہ تشدد میں رول کم ہو گیا ہے، آج بھی ان کا رول اس معاملہ میں بڑا بنیادی ہے لیکن یہ کہ کر ہمیں دوسری سیکولر جماعتوں کو خصوصاً حکمراں جماعتوں کو فرقہ واریت پھیلانے کے الزام سے بری الذمہ قرار نہیں دینا چاہئیے۔ میں اس میں مخالف پارٹیوں کو بھی شامل کرتا ہوں جو سیکولرزم کا دعویٰ کرتی ہیں۔

اب میں ان باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے نظریئے کی ان خصوصیات پر روشنی ڈالوں گا جو آج کے حالات میں ہماری بہتر رہنمائی کر سکتی ہیں۔ سب سے پہلے میں اس بات پر زور دینا چاہوں گا کہ ہر فساد میں کچھ مقامی عوامل ہوتے ہیں (MICROFACTORS) اور کچھ عوامل ملک گیر اہمیت یا بین الاقوامی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں (MACROFACTORS) جبکہ اول الذکر عوامل نظریاتی کم اور مقامی مسائل سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں، موخر الذکر عوامل اکثر نظریاتی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئیے کہ دونوں قسم

کے عوامل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ہر فساد میں دونوں نوعیت کے عوامل اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ ملک میں ہو رہی سماجی اور معاشی تبدیلی ہماری سیاست پر اثر انداز ہوتی ہے اور سیاست کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ فرقہ وارانہ حالات پر۔ بالائی ساخت میں ہونے والی تبدیلیوں کو بنیاد میں ہونے والی تبدیلیوں کی روشنی میں ہی اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے، حالانکہ ان میں ایک اور ایک کا رشتہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آج کے ہندوستان میں فرقہ وارانہ تشدد کی نوعیت سمجھنے کے لئے مختلف طبقات، سماجی اداروں، سیاسی جماعتوں۔ وہ چاہے سیکولر ہوں یا فرقہ پرست ــ اور اس نزاع میں شامل فرقوں کے چنندہ افراد (ELITE) کی اُمنگوں کے رول کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ بات بھی ہمیں ذہن نشین کرنا ہوگی۔ اور یہ بڑی اہم بات ہے کہ عام تاثر کے برخلاف مذہب فرقہ واریت کی بنیادی علت نہیں ہے۔ بلکہ یہ مفاد پرستوں کے ہاتھوں میں ایک طاقتور آلۂ کار ہے جسے وہ اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ عوام سے اپنی اصلیت چھپانے کے لئے اور اپنے مفاد کی پردہ پوشی کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنایا جاتا ہے۔ یہ مفاد پرست سیاسی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں اور معاشی نوعیت کے بھی۔ اکثر سیکولر اور معقول قسم کے افراد بھی مذہب کو اس جھگڑے کی بنیاد سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں ــ فرقہ وارانہ مسئلے کی جانب یہ غیر عمرانیاتی (UNSOCIOLOGICAL) اپروچ ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں مذہبی تشدد ــ جس کی بنیاد بین مذہبی ادعائیت پر ہوتی ہے۔ اور فرقہ وارانہ تشدد۔ ــ جس کی بنیاد دو مذہبی جماعتوں کے چنندہ افراد کے درمیان سیاسی اور معاشی اقتدار پر قبضہ جمانے کے مقصد سے ہوتی ہے۔ فرق کرنا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ فرقہ واریت سیکولر معاملات۔ سیاسی، سماجی اور معاشی۔ سے جنم لیتی ہے اور فرقہ پرست جماعتوں کے لیڈر عام طور پر مذہبی پیشوا نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ غیر مذہبی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ تقسیمِ وطن سے پہلے مسلم لیگ کے رہنما محمد علی جناح تھے جو بالکل مغرب زدہ اور اپنے نظریئے میں تجدد پسند تھے اور ہندو مہاسبھا کی نظریاتی رہنمائی ویر ساورکر کر رہے تھے جو سماجی اور مذہبی اُمور میں نہ صرف جدت پسند بلکہ ہندو مذہب کی اصلاح کے زبردست حامی بھی تھے۔ نہ مسلم لیگ نہ ہندو مہاسبھا کی باگ ڈور کسی مذہبی

رہنما مُلّا یا پنڈت کے ہاتھ میں تھی۔ فرقہ واریت سیکولر مسائل کے لئے مذہب کے نام پر لڑی جانے والی جنگ کا نام ہے۔ اس لئے ہمارے ذہن میں اس بات سے اُلجھن یا انتشار پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ فرقہ وارانہ تشدد میں مذہب کو آلۂ کار بنایا جاتا ہے۔ فرقہ واریت کی اصلی نوعیت اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔

اب ہم پہلے قومی اور بین الاقوامی نوعیت کے عوامل کا اس سلسلے میں جائزہ لینا چاہیں گے جو فرقہ واریت کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ فرقہ واریت کی نظریاتی بنیاد کو سمجھنے کے لئے سب سے اہم بات ایک طرف سماج کی طبقاتی نوعیت ہے تو دوسری طرف معاشی پس ماندگی اور ذرائع کی کمی ہے۔ معاشی پس ماندگی اکثر غیر متوازن (UNEVEN) ترقی کی صورت اختیار کر لیتی ہے کچھ علاقے یا کچھ مذہبی فرقے ذرائع پر قبضہ کر کے زیادہ ترقی کر جاتے ہیں اور کچھ پس ماندہ رہ جاتے ہیں اور یوں علاقائی یا مذہبی تشخص کا مسئلہ بڑی سنگین صورت اختیار کر لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں معاشی پس ماندگی یا محرومیت کا احساس علاقائی یا فرقہ وارانہ شناخت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ آج آسام اور پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی صورتِ حال کا پُرتشدد اظہار ہے۔ اس پر آگے چل کر ہم روشنی ڈالیں گے۔

مختلف مذہبی گروہوں کی معاشی ترقی اگر غیر متوازن ہو تو ایسے سماج میں طبقوں کی ساخت (CLASS STRUCTURE) ــ وہ سرمایہ دار طبقے ہوں یا مزدور طبقے یا درمیانے طبقے ــ یکساں نہیں ہوتی۔ یعنی طبقاتی مفادات اور مذہبی یا علاقائی مفادات ایک دوسرے کی کاٹ کرنے لگتے ہیں۔ اور طبقاتی منطق میں فرقہ وارانہ اور علاقائی منطق شامل ہو جاتی ہے۔ اس طرح پس ماندہ یا ترقی پذیر سماج میں ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ سماج کی طرح طبقاتی وحدت اور طبقاتی مضبوطی (CLASS UNITY AND CLASS SOLIDARITY) پیدا نہیں ہو پاتی اور طبقاتی شعور پر فرقہ وارانہ شعور یا علاقائی شعور حاوی ہو جاتا ہے۔ پس ماندہ فرقے کے اوپری طبقے زیادہ ترقی یافتہ فرقے کے اوپری طبقوں میں ایک دوسرے کی طرف معاندانہ جذبہ رکھتے ہیں (حالانکہ طبقاتی منطق کے تحت اوپری طبقوں میں ایک دوسرے کی طرف معاونت کا جذبہ ہونا چاہیئے) اسی طرح محنت کش طبقوں میں بھی فرقہ وارانہ بنیادوں پر ایک دوسرے کی جانب حریفانہ اور دشمنانہ جذبہ پیدا

ہوجاتا ہے اور دونوں فرقوں کے (ELITES) اپنے اپنے مفادات کے لئے نچلے طبقوں کے جذبات کو اُبھارتے ہیں۔ اور دونوں فرقے کے چیدہ چیدہ افراد اپنی طبقاتی مانگوں اور اُمنگوں کو فرقہ وارانہ شکل میں پیش کرتے ہیں۔ مذہب کی آڑ میں طبقاتی مفادات کی لڑائی لڑنا ہندوستان جیسے ملک میں بہت آسان ہے جہاں مذہب کی گرفت عوام پر بڑی مضبوط ہے۔ طبقاتی مفادات کی حامل ٹھوس معاشی مانگوں کو شامل کر لیا جائے۔ جیسا کہ تقسیم وطن سے پہلے مسلم لیگ نے کیا تھا اور آج ہندو فرقہ پرست جماعتیں کر رہی ہیں۔ تو اپنے ہم مذہب عوام کے جذبات کو اُبھارنا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔

اس معاملے میں ماضی کی اپیل بھی بڑی پُر کشش ہوتی ہے۔ خصوصاً اگر تاریخ کو دیومالائی یا افسانوی شکل دے دی جائے جسے انگریزی میں (MYTHOLOGISING HISTORY) کہتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں طرف سے فرقہ پرست ماضی کے قصیدے پڑھتے ہیں اور عظمتِ رفتہ پر فخر کرتے ہیں گویا ماضی میں نہ کوئی مسائل تھے نہ کسی قسم کی سیاسی معاشی نزاع۔ نہ استحصال تھا نہ جبر و ظلم۔ اگر ظلم و زیادتی تھی تو ایک فرقے کی جانب سے دوسرے فرقے کی جانب۔ اور اپنے اپنے فرقے میں مکمل ہم آہنگی اور یک جہتی پائی جاتی تھی۔ ایسی باتیں نچلے درمیانے طبقے کو (PETTY BOURGEOIS) جس پر مذہبی گرفت بھی زیادہ ہوتی ہے اور جو معاشی استحصال کا بھی مقابلتاً زیادہ شکار ہوتا ہے بہت اپیل کرتی ہیں۔ ہمارے سماج میں فرقہ واریت کی فضا پیدا کرنے کے لئے تاریخ کو افسانہ بنانے کی جتنی کوشش ہوئی ہے اس کی نظیر کہیں اور مشکل ہی سے ملے گی۔

ایسی فضا میں طبقاتی شعور اور طبقاتی وحدت کا جذبہ مشکل ہی سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات محنت کش طبقوں پر زیادہ لاگو ہوتی ہے کیونکہ یہ پس ماندہ سماج کا پس ماندہ ترین حصہ ہے اور سب سے زیادہ روایتی مذہب کی گرفت میں ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے یہی طبقہ فرقہ وارانہ تشدد کا سب سے زیادہ شکار ہوتا ہے۔ ذاتی سطح پر بھی اور طبقاتی سطح پر بھی۔ اوپری طبقے بڑی چالاکی سے تاریخ کو افسانوی رنگ دے کر ان کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں اور انھیں اپنے طبقاتی مفاد کے لئے حرکت میں لاتے ہیں۔ اوپری طبقے اس قسم کے جذبات کے امکانات کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

اب ہم فرقہ وارانہ نظریئے کے ایک اور اہم پہلو کی طرف آتے ہیں۔ فرقہ واریت، تمام ماہرین سماجیات اس پر متفق ہیں، ایک شہری مظہر ہے اور اس کی جڑیں، جیسا کہ اوپر بتایا گیا نچلے درمیانے طبقے میں پائی جاتی ہیں۔ کسانوں، مزدور د ں اور دیگر اوپری طبقوں میں ان کے حامیوں کی تعداد مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ فرقہ واریت کو ہوا دینے کے لئے اس نچلے درمیانے طبقے کے جذبات کو خاص طور سے اُبھارا جاتا ہے۔ اس طبقے کی ایک اور اہم خصوصیت ہے اطاعت شعاری۔ یہ طبقہ چونکہ نفسیاتی اعتبار سے اپنے آپ کو سب سے زیادہ غیر محفوظ محسوس کرتا ہے، اس لئے اس میں اہلِ اقتدار (AUTHORITY) کے سامنے جھکنے کا رجحان بہت زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اسی میں وہ اپنی حفاظت محسوس کرتا ہے۔ پھر یہ (AUTHORITY) مذہبی ہو یا سیاسی ہٹلر کی طاقت کا بھی اصلی سرچشمہ یہی طبقہ تھا۔

فرقہ پرست جماعتیں اس رجحان کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتی ہیں اور آمرانہ اور غیر جمہوری طرز کی تنظیم پر زور دیتی ہیں۔ آر ایس ایس اور جماعتِ اسلامی دونوں جماعتوں میں اطاعت شعاری کو سب سے بڑا وصف سمجھا جاتا ہے۔ حکم کی پابندی کو اہم ترین فریضہ قرار دیا جاتا ہے۔ عام اراکین کے لئے گرو جی یا امیر کے احکامات کسی سوال یا بحث کی زد میں نہیں آسکتے۔ آر ایس ایس میں اس بات پر جماعت کے مقابلے میں بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ماضی کی روایتوں کی جانب بھی یہی رویہ ہوتا ہے اور یہ رویہ سماج میں تبدیلی اور ترقی کی راہ میں زبردست رُکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ فرقہ واریت کو روشن خیالی کے بجائے دقیانوسیت کی ہی فضا راس آتی ہے۔

قومی سطح کے اب ہم ایک اور پہلو کی طرف آتے ہیں جس کا فرقہ واریت کے نظریئے سے گہرا تعلق ہے۔ سماجی تبدیلی کی حرکیات جو معاشی ترقی کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے اپنے مسائل پیدا کرتی ہے، خاص طور سے ایک روایتی سماجی ڈھانچے میں۔ یہ تبدیلی ان طبقات میں جو اس کی زد میں آتے ہیں (اور اس تبدیلی کا انھیں فائدہ نہیں پہنچتا) غیر محفوظ ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے ایسے حالات میں محنت کش اور نچلے درمیانے طبقے اس احساس کا خاص طور سے شکار ہوتے ہیں جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا ان طبقوں پر روایت کی گرفت زیادہ ہوتی ہے اور تبدیلی سے پیدا ہونے والا غیر محفوظ ہونے کا احساس روایت کی اس گرفت کو اور مضبوط بناتا ہے کیونکہ روایت ان کے لئے

پناہ گاہ ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح سماج کے یہ طبقے مذہبی احیاء پرستی کے لئے بڑی زرخیز زمین ثابت ہوتے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سماجی تبدیلی اور معاشی ترقی سماج میں عقل پرستی (RATIONALISM) کے رجحان کو بڑھاوا دیتی ہے۔ لیکن یہ بڑا ہی میکانکی اور سطحی قسم کا اپروچ ہے۔ سماجی حقیقت دراصل اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ عقل پرستی کا رجحان سماج کے ان ہی حصّوں یا طبقوں میں مقبول ہوتا ہے جنھیں سماجی تبدیلی اور معاشی ترقی سے فائدہ پہنچتا ہو اس کے برخلاف وہ طبقے جو ان فوائد سے محروم رہتے ہیں اور اپنے روایتی طرز زندگی سے بھی اُکھڑ جاتے ہیں ان میں یہ تبدیلی غیر محفوظ ہونے کا شدید احساس پیدا کرتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ماضی کی کشش اور بڑھ جاتی ہے۔ چونکہ پس ماندہ ملکوں میں یہ طبقہ بہت بڑا ہوتا ہے اس لئے روایت پرستی اور مذہبی احیاء پرستی سماجی تبدیلی کے ساتھ زور پکڑتی جاتی ہے اور مذہب کی اہمیت کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے سماج میں رجنشوں، مہیش یوگیوں، فقیروں، سائی باباؤں اور طرح طرح کے مذہب کے نام پر ڈھونگ رچانے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جو آج کے صنعتی شہروں میں پیدا ہونے والے اعصابی تشنج اور دیگر ذہنوں پر دباؤ ڈالنے اور تھکانے والے مسائل کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسی ہی فضا میں مذہبی تہواروں کی اہمیت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے اور ان تہواروں پر اکثر جھگڑے ہوتے ہیں۔

اس قسم کی نام نہاد مذہبی تنظیمیں بلیک مارکیٹنگ، اسمگلنگ، منافع خوری وغیرہ جیسی لعنتوں سے پیدا ہونے والے نو دولتیوں کے لئے بھی بڑی نعمت ثابت ہوتی ہیں۔ ان تنظیموں سے ان میں نہ صرف قدر شناسی (RATIONALISM) حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ برسراقتدار سیاسی جماعتوں کو روپیہ فراہم کرنے کا ذریعہ بھی بن جاتی ہیں۔ اکثر سیاست داں ایسی تنظیموں سے اپنی روحانی تسکین یا مذہبی عقیدت کے تحت نہیں بلکہ اپنے سیاسی مفادات کی خاطر وابستہ ہوتے ہیں اور انھیں ہر طرح کی قانونی کارروائی سے بھی بچائے رکھتے ہیں۔ حکمراں طبقے ایسی تنظیموں کی ہمت افزائی کرتے ہیں کیونکہ عوام میں اس سے ایک بھرم بنا رہتا ہے اور وہ اپنے

موجودہ حالات کو صبر و تحمل سے برداشت کرتے رہتے ہیں۔ انھیں بدلنے کی ان میں ترغیب پیدا نہیں ہوتی۔ اس طرح بحرانی دور سے گذرتا ہوا سرمایہ دارانہ نظام عوام کے غیض و غضب سے محفوظ رہتا ہے لیکن یہ تنظیمیں بلاواسطہ طور پر فرقہ واریت کو فروغ نہیں دیتیں کیونکہ یہ سیاست سے اپنے آپ کو دور رکھتی ہیں۔ یہ تنظیمیں اُبھرتے ہوئے بورژوازی کی امنگوں کی عکاس نہیں ہوتیں بلکہ ان کے لئے ذہنی پناہ گاہ کا کام کرتی ہیں۔ البتہ ایسی تنظیمیں ملک میں دقیانوسیت کی بقا کی ضرور ضامن ہوتی ہیں اور روشن خیالی اور تبدیلی کی راہ میں شدید رکاوٹ۔ اسطرح فرقہ وارانہ فضا بنانے میں ان سے بالواسطہ مدد ملتی ہے۔

دوسرے زمرے میں مذہبی اساسیت پرست (RELIGIOUS FUNDAMENTALISM) کی تحریکوں جیسے کہ وشواہندو پریشد یا اسلامی اساسیت کی تحریک کو شامل کرتا ہوں۔ ان تحریکوں کے اپنے سیاسی مقاصد ہیں اور یہ تحریکیں دراصل نچلے درمیانے طبقوں کی اُبھرتی ہوئی امنگوں کی آئینہ دار ہیں۔ ان مذہبی احیاء پرست تحریکوں کے واضح سیاسی مقاصد ہیں۔ وشواہندو پریشد نے چند سو ہریجنوں کی تبدیلئ مذہب کا فائدہ اٹھا کر ملک گیر پیمانے پر جارحانہ مسلم دشمن پروپیگنڈہ شروع کر دیا اور فرقہ وارانہ تصادم کو ہوا دی۔ اس کے نتیجہ میں احمد آباد دسمبر ۱۹۸۱ء، پونہ، شولاپور اور پنڈھرپور وغیرہ میں فسادات ہوئے۔ میرٹھ فرقہ وارانہ فساد میں جو ستمبر سے اکتوبر ۱۹۸۲ء تک ہوتا رہا وشواہندو پریشد کا ہاتھ تھا۔ اس فساد میں ۱۰۰ سے زیادہ جانیں تلف ہوئیں۔ وشوا پریشد لاکھوں کی تعداد میں مختلف زبانوں میں پرچے شائع کر رہی ہے اور ہندو مذہب کی جارحانہ تبلیغ کر رہی ہے۔ ان پرچوں میں مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز زبان استعمال کی جاتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وشواہندو پریشد نے فرقہ واریت کے زہر کو ملک میں بڑی تیزی سے پھیلایا ہے۔

قومی سطح کے عوامل (MACRO LEVEL FACTOR) میں جس کا فرقہ واریت کے نظریاتی پہلو پر بڑا اثر پڑتا ہے وہ علاقائی اور مذہبی تشخص کا مسئلہ ہے۔ آج ہمارے ملک میں مذہبی یا علاقائی شناخت پر جارحانہ انداز میں زور دیا جا رہا ہے۔ دراصل یہ محدود معاشی ذرائع میں زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ سماج کے مختلف گروہوں اور

اور فرقوں کی آرزوئیں تیزی سے بڑھتی جارہی ہیں لیکن معاشی ترقی کی رفتار بہت دھیمی ہے۔ اس لئے سماج کے ان مختلف گروہوں، مذہبی اور علاقائی فریقوں اور طبقات میں زیادہ سے زیادہ حصّہ حاصل کرنے پر تصادم ہونا لازمی ہے۔ اپنے اپنے گروہ کے علیٰحدہ تشخص پر زور دے کر انھیں حرکت میں لانا آسان ہوتا ہے۔ مذہبی اور علاقائی تشخص کا انتہاپسندانہ اظہار ہم پنجاب اور آسام کی تحریک کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

آسام کو مرکزی حکومت نے ایک عرصہ سے ترقیاتی منصوبوں سے محروم رکھا تھا۔ اس صوبے کی معاشی ترقی کے لئے زیادہ سرمایہ مُہیّا نہیں کیا گیا۔ اور پھر یہاں بنگالی ایک عرصہ تک حکومت کی آسامیوں اور عہدوں پر قابض رہے۔ اس پر مزید یہ کہ بنگلہ دیش کے غریب کسان بڑی تعداد میں یہاں سرحد پار کرکے آتے رہے۔ اس سے آسام میں بڑی تشویش ناک صورتحال پیدا ہوئی اور یہاں کی علاقائی عصبیت نے انتہاپسندانہ رویّہ اختیار کیا اور اپنے علاقائی تشخص پر جارحانہ طور پر زور دیا۔ اس تحریک کی باگ ڈور آسام کے متوسط اور نچلے متوسط طبقوں کے ہاتھ میں ہے جو اپنی مانگوں کو منوانے کے لئے اپنے لسانی اور تہذیبی تشخص پر زور دے رہا ہے۔ آسامی تشخص آج بنگالی تشخص کے خلاف لڑ رہا ہے تاکہ اُنھیں معاشی ترقی میں زیادہ سے زیادہ حصّہ مل سکے۔ آج آسام کی شہری معیشت مارواڑیوں کے ہاتھ میں ہے۔ آج مارواڑی آسام میں طلبا کا ساتھ دے رہے ہیں لیکن کل آسام کی تحریک مارواڑیوں کے خلاف جا سکتی ہے۔ مارواڑی شہری معیشت پر قابض ہیں۔ آج تصادم دیہاتوں میں زمین کے سوال پر ہو رہا ہے کل اس سے نمٹنے کے بعد شہری معیشت پر قبضہ کرنے کے سوال پر مارواڑیوں سے ہوگا۔ آج آر ایس ایس جس کو مارواڑیوں کی پوری حمایت حاصل ہے، آسام کی تحریک کو مارواڑیوں کی طرف سے توجہ ہٹائے رکھنے کے لئے فرقہ وارانہ رنگ دے رہی ہے۔ آسام کے نیلی علاقے میں بنگالی مسلمانوں کے قتلِ عام میں آر ایس ایس کا بڑا جارحانہ رول تھا۔ آر ایس ایس آج بھی اس کوشش میں سرگرم ہے کہ آسام کی تحریک مسلم دشمن موقف اختیار کرے۔

فرقہ واریت کے نظریئے کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں علاقائی تشخص مضبوط ہوتا ہے فرقہ وارانہ تصادم کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ یہ بات اب تک کیرل، کشمیر، آسام، پنجاب،

تامل ناڈو وغیرہ جیسے صوبوں میں لاگو ہوتی رہی ہے۔ ان ریاستوں میں لسانی اور تہذیبی اعتبار سے مسلمان اور ہندوؤں میں مکمل مماثلت ہے اور ان کا علاقائی تشخص بڑا مضبوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں فرقہ واریت کا زور بہت کم تھا۔ لیکن تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں اس بات کی صحت مشکوک ہوتی جارہی ہے۔ آسام، کشمیر، کیرل وغیرہ میں فرقہ وارانہ طاقتیں اپنا سر اٹھا رہی ہیں۔ ان وجوہات کا جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ پنجاب کا معاملہ ان سب میں بڑا دلچسپ ہے۔

پنجاب میں ہندو اور سکھ مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے بڑی حد تک متحد تھے، بلکہ ایک دوسرے میں جذب تھے۔ ان میں آپس میں شادیاں بھی ہوتی رہی ہیں اور اکثر ہندو گھرانے کا ایک بیٹا سکھ مذہب بھی اختیار کر لیا کرتا تھا۔ تاریخی اعتبار سے بھی پنجابی ہندوؤں اور سکھوں میں کوئی آپسی تصادم نہیں تھا۔ تقسیم وطن کے موقع پر بھی سکھ اور ہندو متحد تھے۔ لیکن اس ہم آہنگی اور تاریخی اتحاد کے باوجود آج ہندوؤں اور سکھوں میں زبردست تصادم ہو رہا ہے۔ آخر ایسی کیا بات ہوگئی؟ ہندوؤں اور سکھوں میں یہ تصادم کیوں پیدا ہوگیا؟

سکھ آج اپنے علیحدہ تشخص پر زور دے رہے ہیں کیونکہ انھیں کئی شکایتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ اکالی صرف اپنی مذہبی مانگوں کے لئے ہی نہیں لڑ رہے ہیں۔ یوں بھی مرکزی حکومت نے ان کی مذہبی مانگوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ اصل سوال تو معاشی مانگوں کا ہے۔ دریاؤں کے پانی میں معقول حصہ، ہائیڈرو الیکٹرک پراجکٹ پر پنجاب کا قبضہ چنڈی گڑھ اور پنجاب سے باہر بیچنے کی آزادی وغیرہ جیسے معاملات پیچیدگی پیدا کر رہے ہیں۔ اکالی، دوسرے لفظوں میں، سکھ دھنی کسانوں کی اُمنگوں کی عکاسی کر رہے ہیں اور ان کا سیدھا ٹکراؤ پنجاب کی سیاست میں ہندو شہری سرمایہ داروں سے ہو رہا ہے۔ اکالی مذہبی مانگوں کی آڑ میں سکھ عوام کو جوش دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی سکھ مذہبی اساسیت پر زور دے کر سکھ دھنی کسان اپنی سیکیولر مانگوں کو منوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اکالی آج اپنے علیحدہ مذہبی اور فرقہ وارانہ تشخص پر بڑی جارحیت سے زور دے رہے ہیں۔ اور وجوہات کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکالی طاقت کی بنیاد جاٹ سکھ ہیں اور جاٹ سکھ خوشحال

کسان ہیں۔ جب خوشحالی بڑھتی ہے تو روایتی اخلاقی بندھن ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں۔ کئی جاٹ سکھ ڈاڑھی بھی ترشوا لیتے ہیں۔ اکالیوں کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ جاٹ سکھ عوام پر ان کی مذہبی گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اسی لئے سکھوں پر اپنی گرفت کو دوبارہ مضبوط کرنے کے لئے ایک طرف بڑے جارحانہ طریقہ سے مذہبی مانگوں اور علیحدہ سکھ تشخص پر زور دیا اور دوسری طرف سکھ دھنی کسانوں اور سرمایہ داروں کی امنگوں کی عکاسی کرتی ہوئی معاشی مانگیں بھی رکھیں ان تمام باتوں نے مل کر سکھوں اور ہندوؤں میں آج ناقابلِ عبور خلیج پیدا کر دی ہے۔ آنند پور صاحب میں پنجاب کی خود مختاری کے سلسلے میں جو قرارداد پاس کی گئی تھی اسے بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر معاشی مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو ہندو اور سکھ جیسے باہم شیر و شکر مذہبی فرقے بھی ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اسی لئے آج پنجاب میں فرقہ واریت کی وبا بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔

کیرل میں بھی آج تک بڑی فرقہ وارانہ ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ حالانکہ وہاں تین الگ الگ مذہب کے ماننے والے ہندو، مسلم اور عیسائی رہتے ہیں۔ اس ریاست میں بھی بڑی لسانی اور تہذیبی وحدت پائی جاتی ہے۔ اسی لئے آج تک یہاں فرقہ وارانہ تناؤ یا تصادم بہت کم پایا جاتا تھا۔ لیکن سماجی اور معاشی تبدیلی کے پیشِ نظر صورت حال تیزی سے بدلتی جا رہی ہے۔ یہ تبدیلی نئی سیاسی طاقتوں کو جنم دیتی ہے اور مختلف سیاسی جماعتوں میں نئے نئے اتحاد (ALLIANCE) ہوتے ہیں جن سے یہ سیاسی تناؤ بڑھتا ہے۔ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے معاہدہ کرنے کے لئے باہم مقابلہ کرتی ہیں۔ اس طرح کچھ فرقہ پرست جماعتوں کو خاصی اہمیت مل جاتی ہے۔ جب معاہدے کی اس سیاست میں مسلم لیگ اور کیرل کانگریس (جو عیسائیوں کی جماعت ہے) کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی اور ان جماعتوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے حق میں کچھ مانگیں تسلیم کرا لیں تو نائر ہندوؤں نے آر ایس ایس کو شہ دی اور کیرل میں بہت جلد آر ایس ایس کا جال پھیل گیا۔ آر ایس ایس کا سیدھا ٹکراؤ سی پی ایم سے بھی ہو رہا ہے کیونکہ آر ایس ایس کمیونسٹ دشمن جماعت ہے ان تمام باتوں کے نتیجے میں کیرل میں بھی فرقہ وارانہ فسادات کی شروعات ہو گئی۔ یہاں سب سے بڑا فساد ۱۹۷۰ء تیلی چری میں ہوا تھا۔ آج کیرل میں ہندوؤں عیسائیوں

میں بھی تصادم بڑھتا جا رہا ہے۔ نلکل کے مقام پر مندر اور گرجے کے جھگڑے نے پیچیدہ سیاسی شکل اختیار کر لی ہے (حالانکہ اب سمجھوتے کی شکل نظر آ رہی ہے)، اس میں بھی معاہدے کی سیاست (FOLITICS OF ALLIANCE) معاملے کو گمبھیر بنا رہی ہے۔ کیرل میں اپنے مفادات کے پیش نظر حکمراں کانگریس بالواسطہ آر ایس ایس کی ہمت افزائی کر رہی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حکمراں جماعتیں، مرکز میں بھی اور ریاستی سطح پر بھی، زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے اور اپنے سیاسی مفادات کو پورا کرنے کے لئے فرقہ واریت کو ہوا دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں کشمیر میں انتخابات کی تازہ ترین مثال دینا بیجا نہ ہوگا۔ اندرا گاندھی نے وادی میں دو چار نشستیں اپنی پارٹی کے لئے زیادہ حاصل کرنے کی خاطر ایسی تقریریں کیں جس سے صاف فرقہ داریت کی بو آتی تھی۔ مزید یہ کہ وہ وادی میں ایک بات کہتی تھیں اور جموں میں دوسری۔ جموں میں انھوں نے ہندوؤں کے جذبات کو اپیل کی اور آر ایس ایس کے کارکنوں نے اندرا کانگریس کو فتح یاب کرنے میں بڑی سرگرمی سے کام کیا نتیجتاً جموں میں بی۔ جے۔ پی کی شکست ہوئی اور اندرا کانگریس کی فتح۔ دوسری طرف فاروق عبداللہ نے اس کا جواب میر واعظ کی جماعت سے سمجھوتا کر کے دیا جو آج بھی ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ اس طرح اپنے آپ کو سیکیولر کہلانے والی جماعتیں بھی اپنے سیاسی مفادات کی خاطر فرقہ پرستی کو خوب ہوا دیتی ہیں۔ فرقہ پرستی سے متعلق نظریہ وضع کرتے وقت ہم اس اہم بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

آج ملک میں معاشی بحران بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ بحران دراصل پوری تیسری دنیا میں کم ترقی یافتہ سرمایہ داری کا بحران ہے۔ تیسری دنیا میں وہ تمام ممالک جو سرمایہ داری کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں وہ اس بحران سے دوچار ہیں۔ سرمایہ داروں کے پاس آج اس معاشی بحران کا کوئی تسلی بخش علاج نہیں ہے۔ اس لئے سرمایہ دار طبقے دوسرے طریقوں سے اس بحران سے نمٹنا چاہتے ہیں اور اس کا سب سے آسان طریقہ ان کے نزدیک مذہبی اساسیت (RELIGICUS FUNDAMEITALISM) اور دقیانوسیت کو فروغ دینا ہے اور سماج کے روایتی فیوڈل ڈھانچے کو مضبوط بنانا ہے۔ یہ بات بھی اب کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ مسز اندرا گاندھی

نے آریہ سماج کے لیڈر مسٹر شال والے کی رہنمائی میں ان سے ملنے والے وفد کی اس بات کے لئے ہمت افزائی کی کہ وہ ہریجنوں کے اسلام قبول کرنے کے خلاف ملک گیر پیمانے پر زوردار مہم چلائیں اس کے بعد ہی وشو ہندو پریشد نے اپنی زوردار مہم کا آغاز کیا۔ ایسے سیاسی داؤ پیچ اندرا گاندھی کو اوپر کی ذات والے ہندوؤں میں مقبول بناتے ہیں اور ان کے ووٹ حاصل کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ آر ایس ایس کہیں خفیہ طور پر اور کہیں کھل کر اس کام میں اندرا گاندھی کی مدد کر رہی ہے۔ آج ملک میں دقیانوسیت پھیلانے کے لئے باقاعدہ ریڈیو اور ٹی وی کا بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان تمام عوامل کو بھی فرقہ واریت پر نظریاتی بحث کرتے وقت مدِ نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

جیسا کہ مضمون کے شروع میں ہم نے اشارہ کیا ہے، فرقہ واریت کو سمجھنے کے لئے ہمیں دونوں سطح اکبر (MACRO) اور سطح اصغر (MICRO) کے عوامل کو مدنظر رکھنا ہوگا اب تلک ہم سطح اکبر کے عوامل سے بحث کر رہے تھے۔ اب ہم اس سلسلے میں چند (MICRO - FACTORS) سے بحث کریں گے۔ دونوں قسم کے عوامل فرقہ واریت کو فروغ دینے میں اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ جائے وقوع پر تفصیلی تحقیقات خاص طور سے مؤخر الذکر عوامل پر روشنی ڈالتی ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ تناؤ کسی معاملہ کو لے کر پیدا ہوتا ہے۔ فرقہ واریت کے نظرئے سے بحث کرتے وقت اکثر ماہرین اس اہم بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو مقامی مسائل سے تعلق رکھتی ہے اور جسے ہم سماجیاتی علوم کی زبان میں (MICRO-LEVEL FACTORS) کہتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ فساد کو ہوا دینے میں کوئی مقامی مسئلہ ہی کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ تقسیم وطن سے پہلے کے دور میں اکثر مسجد کے آگے باجا بجانے یا گاؤ ذبح کرنے کے مسئلے پر فساد ہو جاتا تھا۔ آج بھی اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ اب کئی نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ نئے عوامل بدلتے ہوئے سماجی، معاشی حالات کے تحت حسبِ ذیل ہیں:

(۱) دو فرقوں کے تاجروں یا چھوٹے صنعت کاروں کے درمیان مقامی طور پر مقابلہ۔

(۲) دو فرقوں کے غنڈہ عناصر، جو مختلف جرائم جیسے اسمگلنگ، ناجائز شراب، بغیر لائسنس کے

ہتھیاروں وغیرہ کی تجارت سے تعلق رکھتے ہیں، کے درمیان لڑائی۔

(۳) مقامی الیکشن اور مقامی سیاست سے تعلق رکھنے والے مسائل۔

(۴) ٹریڈ یونین کی طاقت کو توڑنے کے لئے فرقہ پرست طاقتوں کا استعمال۔

فرقہ واریت کے نظریاتی پہلو سے بحث کرتے ہوئے ہمیں کچھ اور مقامی خصوصیات کو مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ فرقہ وارانہ فسادات اکثر درمیانے درجہ کے شہر میں ہوتے ہیں کیونکہ اس قسم کے شہروں میں نچلے درمیانے طبقے کے لوگ جو خاصے دقیانوسی ہوتے ہیں حاوی ہوتے ہیں۔ ان درمیانے درجے کے شہروں میں بھی خصوصاً ان شہروں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۲۰ سے ۵۰ فی صد ہو فرقہ وارانہ فساد کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ یہ امکان اور بھی بڑھ جاتا ہے اگر ایسے شہروں میں ایسے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو جو تجارت یا سرمایہ کاری سے تعلق رکھتے ہوں اور مقامی ہندو تاجروں یا سرمایہ داروں کی اجارہ داری کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہوں۔ اگر اس شہر میں پہلے سے فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے ہوں تو مزید فسادات ہونے کے امکانات اور بڑھ جاتے ہیں۔

یہ تمام خصوصیات ہماری نظر میں ہوں تو یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ کیوں مرادآباد، علی گڈھ، میرٹھ، جمشید پور، بنارس، بھونڈی، مالے گاؤں، حیدرآباد وغیرہ جیسے شہروں میں بار بار فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ اپنی تحقیقات کی روشنی میں میں اس پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔

کسی شہر میں اگر اقلیت کی تعداد زیادہ ہو تو پارلیمانی نظام میں ووٹوں کی تعداد کے مدِ نظر اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ سیاسی پارٹیوں کی نظر اکثر ووٹوں کی تعداد پر ہوتی ہے۔ حکمراں کانگریس یا دوسری سیاسی جماعتیں ووٹوں کے لئے مسلمانوں کو اگر دکھاوے کے لئے بھی اہمیت دیتی ہیں تو ہندو فرقہ پرست جماعتیں اس پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتی ہیں اور اسے ان کی بیجا خوشامد قرار دیتی ہیں۔ اس طرح دونوں طرف سے اپنے اپنے فرقہ وارانہ تشخص پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر ووٹوں کے لئے سیاسی جماعتیں اپیل کرنے لگتی ہیں۔ میرٹھ میں جہاں مسلمانوں کی تعداد ۴۰ فیصد ہے، کانگریس آئی بھی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم ہو گئی تھی۔ کانگریس ہائی کمان مسلمانو کی تعداد کو دیکھتے ہوئے اسمبلی یا پارلیمنٹ کے لئے مسلم امیدوار کو ٹکٹ دینے پر ترجیح دیتی ہے

تھا اس سے مقامی کانگریس آئی کے ہندو امیدوار ناراض ہوتے ہیں اسی لئے فسادات کے دوران میرٹھ میں کانگریس آئی کی مقامی ہندو لیڈرشپ نے بی جے پی سے خفیہ طور پر ہاتھ ملا لیا تھا۔ مندر مزار کا جھگڑا اسی سیاسی اُمنگ کا علامتی اظہار تھا۔ دراصل اس کے پیچھے سیاسی اقتدار کی جنگ جاری تھی۔

بہار شریف میں، سیاسی عوامل کم اور معاشی عوامل فسادات میں زیادہ نمایاں تھے۔ نالندہ ضلع کے اس شہر میں بھی مسلمانوں کی کافی تعداد ہے۔ تقریباً ۲۰ فیصد۔ یہاں بڑی بڑی قبرستانوں کی زمینیں ہیں جو اب عام طور پر استعمال نہیں ہوتیں۔ آلو کی پیداوار یہاں کافی اچھی ہوتی ہے اور یہ بڑی منافع بخش بھی ہے۔ آلو کی حفاظت کے لئے اب یہاں کئی کولڈ اسٹوریج بھی بن رہے ہیں اور بہار شریف تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ زمین کی قیمتیں آسمان سے بات کر رہی ہیں یادو ذات کے ہندو جو عام طور سے کاشت کاری کرتے ہیں، خالی زمینوں پر نظریں لگائے ہوئے ہیں۔ قبرستان کی زمینوں کو لے کر ان میں اور مسلمانوں میں اکثر جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ایک قبرستان کی زمین کو لے کر ہی بہار شریف میں فساد پھٹ پڑا۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یادوؤں کی پشت پناہی آر ایس ایس کرتی ہے۔ آر ایس ایس کا مقصد سیاسی ہے۔ وہ ہر ایسی طاقت کا استعمال کرتی ہے جس کا ٹکراؤ مسلمانوں سے ہو۔ بہار شریف میں اکثر غریب مسلمان بیڑی مزدور ہیں اور ان کی یونین سی پی آئی کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں سے ایم ایل اے اور ایم پی بھی سی پی آئی کے ہی ہیں سی پی آئی یہاں مسلم ووٹوں سے ہی جیتتی ہے۔ اس طرح آر ایس ایس کو مسلمانوں سے دوہری دشمنی تھی۔ وہ مسلمانوں کو بھی اور سی پی آئی کو بھی سبق سکھانا چاہتی تھی۔ اُس نے یادوؤں کی پُشت پناہی کرکے انھیں مسلمانوں سے بھڑا دیا۔ اور طبقاتی شعور کی فضا کو آناً فاناً فرقہ وارانہ شعور سے بدل دیا۔ غریب ہندو اور مسلمان اپنے طبقاتی مفادات کو بھول کر ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھنے لگے اور اپنے ہم مذہب استحصال کرنے والوں کو اپنا دوست فرقہ وارانہ فسادات کا ایک یہ اہم مقصد ہے۔

گودھرا فسادات میں تصادم خاص طور سے سندھیوں اور گھانچی مسلمانوں کے درمیان تھا۔ گھانچی مسلم بڑے محنتی اور جفاکش ہیں اور معاشی طور پر ترقی کر رہے ہیں۔ پنچ محل ضلع میں ٹرانسپورٹ کے پیشے میں آج انھوں نے اپنی اجارہ داری قائم کر لی ہے۔ سندھیوں اور گھانچی مسلمانوں میں چھوٹے پیمانے پر بیوپار میں مقابلہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں فرقوں کے چند افراد غیر قانونی دھندوں

اور ناجائز شراب کے پیشے میں بھی ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ گودھرا میں رہائشی مکانوں کی سخت قلت ہے اور چونکہ سندھی معاشی اور تہذیبی اعتبار سے اسی سطح پر ہیں جس سطح پر گھانچی مسلم، اُن کی نگاہ اِن کی ملکیتوں پر لگی رہتی ہیں۔ اور پھر سندھیوں اور گھانچیوں کے درمیان اسٹیشن روڈ پر ٹھیلے لگانے کے لئے اکثر جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کچھ مقامی سطح (MICRO LEVEL FACTORS) ہیں جن کی وجہ سے سندھیوں اور گھانچی مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات ہو جاتے ہیں۔ گجراتی ہندو اور دوسرے مسلمان حالانکہ ان فسادات میں اپنے اپنے ہم مذہبوں سے ہمدردی ضرور رکھتے ہیں، لیکن ان فسادات میں عملی طور پر فعال حصّہ نہیں لیتے۔ اس سے بھی یہ بات صاف اُبھر کر آتی ہے کہ جھگڑے کی بنیاد محض مذہب نہیں ہے بلکہ دوسرے دنیوی مسائل ہیں۔

اوپر کی مثالوں سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہندؤں اور مسلمانوں کو بالکل ہم آہنگ (HOMOGENOUS) اور غیر متفرق وحدت تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ ان میں ذات پات اور برادیاں ہوتی ہیں اور فرقہ وارانہ فسادات میں عام مذہبی ہمدردی کے باوجود وہی ذاتیں اور برادریاں عملی طور پر شامل ہوتی ہیں جن میں آپس میں مادی مسائل پر جھگڑا ہوتا ہے ویسے نسلی، لسانی اور تہذیبی اعتبار سے بھی کسی مذہبی جماعت کو ایک ہی وحدت قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

جیسے کہ اوپر بتایا گیا، معاشی مقابلہ کا نتیجہ اکثر فسادات کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اور خاص طور سے جب مسلمان اس معاشی مقابلے میں آگے نکل رہے ہوں۔ یہ ایک ایسی تجربی حقیقت ہے جو تحقیقات کے دوران ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہم اوپر بہار شریف اور گودھرا کی اس سلسلے میں مثال دے چکے ہیں۔ علی گڑھ، مراد آباد وغیرہ کی بھی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ علی گڑھ میں تالے کی صنعت اور مراد آباد میں پیتل کی صنعت میں آپسی مقابلے کی وجہ سے فسادات ہو چکے ہیں۔ ان ہی باتوں کی بنیاد پر بعض ماہر سماجیات نے فرقہ وارانہ تشدد سے متعلق یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دراصل یہ سماجی ساخت میں تبدیلی کا نتیجہ ہیں جسے انگریزی میں (STRUCTURAL VIOLENCE) کہتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے لیکن ہمیں

دوسرے عوامل کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے جن پر ہم اوپر روشنی ڈال چکے ہیں۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ مسلمانوں کو معاشی ترقی کے میدان میں ایک ایک انچ آگے بڑھنے کے لئے اپنا خون بہانا پڑے گا۔یہ بڑا انتہا پسندانہ نظریہ ہوگا۔اس سے البتہ ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ پس ماندہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ نظام کے برخلاف، طبقاتی تصادم کی جگہ ایک حد تک ذات پات، فرقہ وارانہ یا نسلی اور لسانی تصادم لے لیتا ہے۔خصوصاً ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذہب، نسل اور زبان بولنے والے لوگ رہتے ہیں۔غیر متوازن ترقی کے نتیجہ میں کچھ ذاتیں، مذہبی جماعتیں اور لسانی علاقے ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور ان مذہبی، لسانی یا نسلی وحدتوں کے اوپری طبقے اور منتخب افراد اپنی اپنی جماعتوں کی عصبیت کو ابھار کر اپنے مفادات کی لڑائی لڑتے ہیں۔اسلئے ایسے پیچیدہ سماجی نظام میں طبقاتی مفاد پر مذہبی، لسانی یا علاقائی عصبیت غالب آجاتی ہے۔یورپی سماج کے طبقاتی تصادم کا ماڈل ہمارے حالات میں جوں کا توں لاگو نہیں ہوتا۔

مقامی سطح کے عوامل میں دوسری اہم بات فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں سماج دشمن عناصر کا رول ہے۔یہ عناصر بڑے طاقتور گروہوں میں منظم ہوتے ہیں اور یہ اپنا قانون چلاتے ہیں یہ طاقتور گروہ بڑے بڑے شہری علاقوں کی ذیلی دنیا (UNDER WORLD) میں ناجائز شراب اسمگلنگ اور غیر قانونی ہتھیاروں کے پیشوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ذیلی دنیا کے ان عناصر کا پھیلاؤ ایک معنیٰ میں صنعتی پھیلاؤ اور دیہاتوں میں سبز انقلاب کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔شہروں میں کالا پیسہ بڑھنے سے شراب اور اسمگل شدہ بدیسی اشیاء کی مانگ بڑھتی ہے اور دیہاتوں میں نچلی ذات کے کھیت مزدوروں کو زیادہ اجرت کی مانگ کرنے پر خوفزدہ کرنے کے لئے ہتھیاروں کی مانگ بڑھتی ہے اس طرح بڑی بڑی جرائم پیشہ جماعتیں وجود میں آتی ہیں۔یہ جماعتیں اپنے طور پر خود مختار ہوتی ہیں۔ان گروہوں کا رول بھی فرقہ وارانہ فسادات میں دن بدن بڑھتا چلا جارہا ہے۔بڑودہ کا فساد اس کی بہترین مثال ہے۔

دو ناجائز شراب کا پیشہ کرنے والے جرائم پیشہ گروہوں۔جن میں ایک ہندو اور دوسرا مسلم گروہ تھا۔میں تصادم نے ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۲ء میں فرقہ وارانہ تشدد کی صورت اختیار

کرلی۔ ایک گروہ کو جس کا سردار شیوا کہار ہے، حکمراں جماعت کی سرپرستی حاصل تھی۔ حکمراں جماعت کی ایک ٹکری کہا جاتا ہے، اس گروہ کی اپنے مفادات کے پیشِ نظر ہمت افزائی کر رہی تھی۔ یہاں یہ بات نوٹ کرنا ضروری ہے کہ آج کل سیاست دانوں کو چناؤ لڑنے کے لئے ایسے جرائم پیشہ گروہوں کے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی خوفزدہ کرنے والی قوت کی بھی۔ دونوں باتوں سے ووٹ حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ادھر جرائم پیشہ عناصر کو بھی اپنے تحفظ (خصوصاً پولس اور قانونی کارروائی سے تحفظ) اور سماج میں ایک طرح کی قدر شناسی حاصل کرنے کے لئے سیاسی سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے۔

جمشید پور اور مراد آباد کے فسادات میں بھی سماج دشمن عناصر کا ہاتھ تھا۔ مختلف فسادات کی تحقیقات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں یہ خطرہ بڑھتا جائے گا۔ معیشت میں کالا پیسہ اور دولت کا تمرکز جتنا بڑھے گا جرائم بھی اسی تناسب سے بڑھتے جائیں گے۔ حالیہ حیدرآباد کے فسادات میں بھی چاقوزنی کے واقعات میں (ایسے ہی تربیت یافتہ جرائم پیشہ عناصر حصہ لے رہے ہیں۔ سیاست اور جرائم کا الحاق سماج کے لئے بڑا خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فرقہ واریت کا ہمہ گیر نظریہ وضع کرنے کے لئے ہمیں سطح کبیر اور سطح صغیر (MACRO AND MICRO LEVEL FACTORS) کے عوامل کو مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ سطح کبیر میں ہم قومی پیمانے پر ہونے والی سماجی۔ معاشی تبدیلیاں، صوبائی اور مرکزی حکومت میں حکمراں جماعت اور مخالف جماعتوں کی پالیسیاں، مختلف سیکولر سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ، چناؤ جیتنے کے لئے ذات پات اور مذہبی جماعتوں سے اپیل، حکمراں طبقوں کا معاشی بحران کا مقابلہ کرنے کے لئے مذہبی اساسیت کی ہمت افزائی وغیرہ جیسے عوامل کو شامل کریں گے۔ یہ بات آج بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ حکمراں جماعتیں اپنے سیاسی مفاد کے لئے فرقہ وارانہ تشخص کو تقویت پہنچا کر سماج میں اس مناقشے کو مضبوط بناتی ہیں فرقہ واریت کا الزام محض معروف فرقہ وارانہ جماعتوں جیسے کہ آر ایس ایس یا جماعتِ اسلامی پر دھرنے سے کام نہیں چلے گا۔

دوسری طرف سطح صغیر (MICRO LEVEL) پر ہمیں فسادزدہ شہر میں

مسلمانوں کی آبادی کا تناسب، ہندوؤں اور مسلمانوں میں معاشی مقابلے کی نوعیت، اس شہر میں فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ، بلدیہ کی مقامی سیاست، جرائم پیشہ عناصر کا رول، مقامی سیاسی جماعتوں میں آپسی الحاق یا ٹکراؤ جیسے عوامل کو مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ کسی بھی فساد میں دونوں قسم کے عوامل کام کرتے ہیں۔ کہیں سطحِ کبیر کے عوامل کا رول زیادہ ہوتا ہے کہیں سطحِ صغیر کے عوامل کا۔ بعض انتہائی حالات میں صرف کسی ایک ہی قسم کے عوامل کا رول ہوتا ہے۔ مثلاً گودھرا اور بڑودہ کے فسادات میں محض مقامی سطح کے عوامل کام کر رہے تھے جب کہ ۱۹۶۹ء کے احمد آباد فساد میں قومی پیمانے کے عوامل کا بڑا زبردست رول تھا۔ حکمراں کانگریس میں تفرقہ، بینکوں کو قومیانے سے بائیں بازو کی طرف جھکاؤ کا خطرہ جیسی باتوں نے دائیں بازو کی جماعتوں جن میں جن سنگھ کا نمایاں رول تھا، فرقہ واریت کو ہوا دینے پر اُکسایا اور جن سنگھ نے قومی سطح پر مسلم جارحیت کا افسانہ پھیلایا اور اپنی پارٹی کے اجلاس میں مسلمانوں کو ہندیانے (INDIANISATION) کی قرارداد بھی پاس کر ڈالی۔ ایسی ہی فضا میں احمد آباد کا فساد ہوا جس نے سارے ملک کو چونکا دیا۔ اس زمانے میں کانگریس (او) یعنی تنظیمی کانگریس نے جن سنگھ کے ساتھ اتحاد کر رکھا تھا اور احمد آباد کے فساد کے پیچھے اصل مقصد اندرا گاندھی کو بوکھلانا تھا اور عوام کی توجہ بائیں بازو کی سمت لینے والی سیاست سے ہٹا کر فرقہ وارانہ جارحیت کی طرف مبذول کرنا تھا۔ اس دور میں دوسرے تمام مسائل پسِ منظر میں چلے گئے اور سارے ملک میں فرقہ واریت کا ہی چرچا ہونے لگا۔

ختم کرنے سے پہلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس ملک میں آج بھی فرقہ وارانہ تشخص طبقاتی تشخص کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقتور ہے اور حکمراں طبقے اس بات کا پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ معاشی ترقی کی رفتار بہت کم ہونے کی وجہ سے فرقہ وارانہ بنیاد پر چھینا جھپٹی بڑھے گی اور اس سے فرقہ وارانہ تصادم کا خطرہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا اور حکمراں طبقے طبقاتی جنگ کو بڑی آسانی سے فرقہ وارانہ جنگ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم فرقہ وارانہ تصادم کا سائنٹفک نظریہ وضع کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس حقیقت کا جتنی جلدی ہو سکے احساس کر لینا چاہیئے۔

اکتوبر ۱۹۸۳ء

فرقہ واریت کی سماجی اور معاشی بنیادیں

ہندوستان میں فرقہ واریت کی سماجی اور معاشی بنیادوں کو سمجھنا بیحد ضروری ہے۔ فرقہ واریت سے متعلق کافی غلط فہمی ہے اور عام طور پر اسے مذہبی تصادم تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ مکمل حقیقت نہیں ہے۔ یہ سماجی منظہر (PHENOMENON) بے حد پیچیدہ ہے اور اس کے کئی مختلف پہلو ہیں۔ مذہب، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، محض ایک پہلو ہے حالانکہ یہ اپنی جذباتی اپیل کی وجہ سے بہت اہم پہلو تصور کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے فرقہ واریت کی حقیقت سمجھنے میں کافی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے فرقہ واریت کی اصل حقیقت سمجھنے کے لئے اس کی سماجی اور معاشی بنیادوں (SOCIO-ECONOMICS BASES) کا پتہ لگانا بہت ضروری ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اس اہم مسئلے سے بحث کریں، ہمیں سماجی اور معاشی بنیادوں کے صحیح مفہوم کو سمجھ لینا بھی اشد ضروری بات ہے۔ ہر سماج — چاہے اس کی بنیاد غلامی کے نظام پر ہو یا جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام پر — کی اپنی ایک مخصوص ساخت ہوتی ہے جس کی بنا پر اس سماج کے کچھ طبقے اس میں پیدا شدہ دولت کے مالک بن بیٹھتے ہیں اور اس طرح سماج کے ایک بہت بڑے حصے کو اس کے جائز حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔ ایسے تمام سماج، طبقاتی تقسیم کے علاوہ ذاتوں، نسلوں اور مذہبوں کی بنیاد پر بھی منقسم ہوتے ہیں۔ افریقہ اور ایشیا کے ممالک خصوصاً مؤخر الذکر بنیادوں پر زیادہ بٹے ہوئے ہیں۔

وہ لوگ جو سماجی دولت پر اپنا بھی حق جمانا چاہتے ہیں جو کمیاب ہوتی ہے، وہ جذباتی اپیل کی بنا پر ذات پات اور مذہب کی زبان (CASTE OR RELIGIOUS IDIOM)

استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ نظریاتی ہتھیار بھی استعمال کرتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی اس چھینا جھپٹی کو محروم طبقوں کے لئے قابلِ قبول بنانے کے لئے جواز پیدا کرسکیں۔ مذہب میں لوگوں کو حرکت میں لانے کی زبردست قوت پائی جاتی ہے اور مفاد پرست اس قوت کا پورا پورا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مفاد پرست سماجی اور معاشی معاملات کو مذہبی رنگ میں پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی ایک جذباتی بنیاد بن جاتی ہے اور اسی کے آس پاس حلقہ بندیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ مفاد پرست ان دو قسموں کو بڑی مہارت سے آپس میں جوڑ دیتے ہیں (یعنی مذہبی اور معاشی قسموں کو) اور عوام کے نزدیک مذہبی قسم ہی حاوی رہتی ہے اور معاشی قسم اس میں چھپ جاتی ہے۔

سماجی اور معاشی یا سماجی اور سیاسی جدوجہد کس طرح مذہبی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ہندوستان کی تاریخ مہیا کرتی ہے۔ ہر مذہبی گروہ تاریخ کی مدد سے اپنے ماضی کی شان و شوکت جتانا چاہتا ہے اور اس طرح ماضی کی تاریخ کی بھی جذباتی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور برِ صغیر میں ہر رنگ کے فرقہ پرستوں نے اپنے اپنے ماضی کی تاریخ کا اس معنیٰ میں خوب فائدہ اُٹھایا ہے۔ جہاں مخالفین کے مذہب الگ الگ تھے، سیاسی جدوجہد کو مذہبی رنگ دیکر اسے مذہبی ظلم کے خلاف لڑائی بنا کر پیش کیا گیا اور جہاں مخالفین کا مذہب ایک ہی تھا اسے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت قرار دیا گیا۔ ستیش چندر لکھتے ہیں:

"تمام ہندو تحریکوں کو جو مرکزی حکومت کے خلاف تھیں۔ چاہے اس کا سماجی اور سیاسی مقصد کچھ بھی رہا ہو۔ مسلم مظالم کے خلاف ہندوؤں کی مقاومت کے طور پر پیش کیا گیا اس طرح رانا پرتاپ اور شیواجی کو، جو علاقائی خود مختاری کے لئے لڑ رہے تھے اور چند خاص طبقوں کے نمائندے تھے، ایسے قومی ہیرو سمجھا جاتا ہے جو بدیسی ظالمانہ حکومت کے خلاف لڑ رہے ہوں۔ پھر اس بات سے اس بات کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ جاتا ہے کہ پورا مسلم دور بدیسی حکومت کا دور تھا اور یہ کہ اکبر اور دارا شکوہ بھی اس کے اس بنیادی کردار کو نہیں بدل سکتے تھے۔"

ہندو اور مسلم فرقہ پرست ہندوستانی تاریخی جدوجہدوں کو اسی طرح فرقہ وارانہ رنگ میں رنگ کر پیش کرتے رہے ہیں لیکن جو صحیح سمجھ اور سوجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ

جدوجہد مذہبی گروہوں میں نہیں تھی نہ ہی یہ آپسی مذہبی ٹکراؤ تھا بلکہ دراصل یہ سماجی اور معاشی طبقوں کے درمیان تصادم تھا۔ شیواجی اور اورنگ زیب کے درمیان بھی لڑائی کی نوعیت سیاسی اور معاشی تھی، مذہبی نہیں۔ اس تصادم کی اصل وجہ جاگیردارانہ نظام کا معاشی بحران تھا۔ جو اورنگ زیب کے دور میں پیدا ہو چلا تھا۔ ستیش چندر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"شیواجی اور اورنگ زیب کے درمیان اختلافات کی اصل نوعیت جاگیر اور منصب سے متعلق تھی جو شیواجی حاصل کرنا چاہتا تھا اور بعد میں یہ اختلاف چوتھ اور سردیش مکھی کے متعلق بھی پیدا ہو گیا۔ معاشی وجوہات اور سیاسی حکمتِ عملی کے طور پر مغل حکمراں، اپنی جنوبی سرحد پر جو مغربی ساحل کی طرف جانے والی تجارتی شاہراہ سے ملی ہوئی تھی، ایک طاقتور مراٹھا حکومت کو وجود میں آتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور مالی بحران کے پیشِ نظر شیواجی کی امنگوں کو صرف دکھنی ریاستوں کی قیمت پر ہی پورا کیا جا سکتا تھا۔"

جزیہ بھی عام طور پر مذہبی تنگ نظری کا نتیجہ سمجھا گیا ہے۔ اسے ہندوؤں پر مسلمانوں کے مظالم کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ اگر سماجی اور سیاسی حالات کی پیچیدگیوں کو سامنے رکھا جائے تو جزیہ کو محض مذہبی قسم کی بات قرار دینا معاملات کو کچھ زیادہ ہی آسان بنا لینا ہے۔ جزیہ کا لاگو کیا جانا یا اسے معاف کر دینا صرف حکمراں کی تنگ نظری یا لبرلزم (وسیع النظری) پر ہی منحصر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا بہت کچھ تعلق سماجی اور معاشی حالات سے بھی رہا ہے۔ اورنگ زیب کے دور میں جاگیردارانہ نظام سخت بحران سے گذر رہا تھا۔ مغلیہ خزانے کو پیسوں کی ضرورت تھی تاکہ اس بحران کا مقابلہ کیا جا سکے۔ جہاں اور مضارب لگائے گئے وہاں جزیہ بھی اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے لگایا گیا۔ ہمارے دور میں بھی اکثر حکمراں طبقے سیاسی اور معاشی بحران کا مقابلہ کرنے کے لئے ظالمانہ اور جابرانہ پالیسیاں اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح ماضی میں بھی شدید سیاسی یا معاشی بحران کے دوران ایسی پالیسیاں اختیار کی جاتی تھیں جنھیں آج مذہبی تنگ نظری قرار دیا جا سکتا ہے۔

برطانوی دور میں فرقہ واریت کا ابھار خاص طور سے سرکاری عہدوں اور سیاسی اقتدار میں حصے کے سوال کے اردگرد مرکوز تھا۔ شروع سے ہی مسلم لیگ سیاسی اقتدار میں زیادہ سے زیادہ

حصہ پانے کے لئے جدو جہد کر رہی تھی نہ کہ کسی مذہبی یا الوہی (THEOLOGICAL) نوعیت کے سوال پر۔ اُدھر ہندو فرقہ پرست مُسلم لیگ کی سیاست کا جواب اس کی مانگوں کی مخالفت کر کے اور ہندو اقلیت والے صوبوں جیسے کہ پنجاب، بنگال اور سندھ میں ہندوؤں کی طرف سے ایسی ہی مانگیں پیش کر کے دے رہے تھے۔ موتی لال نہرو رپورٹ بھی جو علیحدہ انتخابات کے سوال کو حل کرنے میں تقریباً کامیاب ہو گئی تھی، پہلے ہندو مہا سبھا کی سخت مخالفت اور بعد میں مسلم لیگ کے ایک حلقے کی مخالفت کے باعث عضوِ معطل بن کر رہ گئی۔

"جناح نے ہندو مہا سبھا کی مخالفت کے پیشِ نظر" اُما کُورا لکھتی ہیں، "اس بات پر اصرار کرنا شروع کیا کہ پرساد پہلے مدن موہن مالویہ اور دیگر لیڈروں کے دستخط حاصل کریں۔ یہ مانگ غیر معقول نہیں تھی اگر یہ بات مدِ نظر رکھی جائے کہ اب تک اتحاد کے لئے کی گئیں کانفرنسیں اور ہندو مسلم کے درمیان تمام بات چیت ہندو مہا سبھا کے مسلم مانگوں کی طرف سخت رویّے کی وجہ سے ناکام ہو گئی تھیں۔" ۳ دہلی کی ان تجاویز سے ان مانگوں کا اصلی کردار بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے جو مسلم رہنما عموماً اور مسلم لیگ لیڈر شپ خصوصاً پیش کر رہی تھیں۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کے دن ۳۰ مسلم لیڈروں نے جن میں جناح (جنھوں نے اس میٹنگ کی صدارت کی) راجہ آف محمود آباد، محمد علی، ایم۔ اے انصاری، راجہ غضنفر علی خان، محمد شفیع وغیرہ شامل تھے دہلی میں ایک میٹنگ کی اور علیحدہ انتخابات کی مانگ پر اصرار نہ کرنے پر متفق ہو گئے بشرطیکہ ان کی چار تجاویز کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے۔ مشیر الحسن لکھتے ہیں "پہلی تجویز یہ تھی کہ بنگالی اور پنجابی مسلمانوں کی قانون ساز اسمبلیوں میں ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق نمائندگی ہو۔ دوسرے یہ کہ مرکزی قانون ساز اسمبلی کی ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کے لئے محفوظ کر دی جائیں اور دوسری دو مانگیں یہ تھیں کہ سندھ کو بمبئی صوبے سے الگ کر کے اسے علیحدہ صوبہ قرار دیا جائے اور اصلاحات کا دائرہ فرنٹیئر پراونس تک وسیع کیا جائے۔ یہ دہلی تجاویز کے نام سے مشہور ہیں۔" ۴

لیکن ہندو فرقہ پرستوں کی سخت مخالفت کی وجہ سے ان تجاویز کا بھی ایسا ہی حشر ہوا۔ موتی لال نہرو بھی، جو ان تجاویز کے حامی تھے اور مسلمانوں کے ساتھ معقول سمجھوتے کی

بات کرتے تھے، اس معاملے میں کچی کھا گئے اور پنجاب بنگال میں مسلمانوں کے لئے اکثریت کے حامی نہ رہے۔ مشیر الحسن کہتے ہیں "شاید انھوں نے یہ رویہ کانگریس میں ہندو عناصر کی خوشنودی کے لئے اختیار کیا۔ جو مستقل اس بات کی مخالفت کر رہے تھے کہ مسلمانوں کے لئے ان صوبوں میں نشستیں محفوظ کی جائیں۔" ۵۹

ان مانگوں اور جوابی مانگوں میں ہم اس بات کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں کہ کس طرح دونوں طرف سے فرقہ پرست طاقتیں حلقہ بندیاں کر رہی تھیں۔ یہ طاقتیں اپنی اپنی حصہ داریوں کے لئے لڑ رہی تھیں۔ انھیں ایک عادلانہ نظام قائم کرنے اور محنت کش عوام اور متوسط طبقوں کی بنیادی ضرورتوں اور امنگوں کو پورا کرنے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ دونوں فرقوں کے چنندہ افراد (ELITES) نئے ابھرتے ہوئے مواقع سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کے لئے اپنے اپنے ہم مذہبوں میں مذہبی بنیادوں پر حمایت حاصل کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ مذہب کی جذباتی اپیل ان کا اصلی اثاثہ تھی۔ پس ماندہ اور استعماریت کے شکار ملک میں جہاں جدید صنعتی نظام کو استعماری طاقتوں کے مفادات کے پیش نظر، خاطر خواہ ترقی کے مواقع میسر نہ ہوں، عقلی رجحانات کی جڑیں مضبوط کرنے کی توقع کرنا ہی بیکار ہے۔ پھر ذرائع کی جتنی کمی ہوتی ہے، ان کو کنٹرول کرنے کی جدو جہد بھی اتنی ہی شدید ثابت ہوتی ہے۔ یہ جدو جہد چاہے طبقاتی خطوط پر ہو یا مذہبی خطوط پر۔ ڈبلیو۔ سی اسمتھ اسی لئے فرقہ واریت کی تعریف سماجی اور معاشی اصطلاحوں میں کرتے ہیں۔:

"ہندوستان میں فرقہ واریت کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ ایک نظریہ ہے جو ہر مذہب کے ماننے والے گروہ کو سیاسی، سماجی اور معاشی وحدت قرار دینے پر زور دیتا ہے اور دوسری طرف ان میں امتیاز کرنے یا معاندانہ رویہ اختیار کرنے پر بھی۔" ۶

ڈبلیو۔ سی۔ اسمتھ نچلے طبقات اور اوپری طبقات کی فرقہ واریت میں بھی فرق کرتے ہیں۔ نچلے طبقہ کی فرقہ واریت کا تعلق فوری معاشی شکایات سے ہوتا ہے اور اکثر اس کا نتیجہ تشدد کی شکل میں سامنے آتا ہے جب کہ اوپری طبقوں کی فرقہ واریت منظم شکل اختیار کرتی ہے، اس کا تسلسل برقرار رہتا ہے اور انتہائی درجوں پر پہنچ کر علیحدگی (SEPERATION) کی صورت

میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اوپری طبقوں کی فرقہ داریت کے درمیان فرق پر روشنی ڈالتے ہوئے اسمتھ لکھتے ہیں۔ "اس فرق کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ نچلے طبقات کی فرقہ داریت طبقات کے درمیان جدوجہد کا روپ اختیار کرتی ہے جب کہ بورژوازی کے لئے یہ ایک ہی طبقے میں شخصی مقابلے کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔"[۸۰]

فرقہ داریت کی بنیاد جدوجہد آزادی کے دوران پڑی اور جوں جوں آزادی ملنے کا وقت قریب آتا گیا، فرقہ واریت کی شدت اتنی ہی بڑھتی چلی گئی۔ آخر کار اس کا نتیجہ تقسیم وطن کی شکل میں ظاہر ہوا اور لاکھوں بے گناہ عوام اس عفریت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس صدی کے پانچویں دہے میں (یعنی آزادی کے بعد پہلے دہے میں)، ایسا لگتا تھا کہ فرقہ داریت کا زور کچھ کم ہوگیا ہے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ اس کی وجہ اور باتوں کے علاوہ ہمیں سماجی اور معاشی حالات میں تلاش کرنی ہوگی۔ یوپی کے چنندہ مسلم افراد جنھوں نے پاکستان کی لڑائی لڑی تھی، تقسیم وطن کے بعد اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے پاکستان چلے گئے۔ جو رہ گئے اُن کا کوئی رہنما نہ تھا اور وہ اتنے سراسیمہ تھے کہ ہندوستانی سیاست میں اپنی اہمیت جتانے کے بھی قابل نہ تھے۔ ان لوگوں کا زیادہ تر تعلق نچلے طبقوں سے تھا۔ چھوٹے چھوٹے یا غریب کسان، بے زمین کھیت مزدور دیہی علاقوں میں اور دستکار، چھوٹے موٹے تاجر اور مزدور شہروں میں۔ یہ لوگ جو ہندوستان میں رہ گئے تھے چونکہ ان کا تعلق نچلے طبقوں سے تھا۔ ان میں نہ معاشی جارحیت تھی نہ یہ ہندو طبقوں سے معاشی میدان میں مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہی رکھتے تھے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی مقابلے کی غیر موجودگی میں فرقہ واریت کو ہوا دینے والی اور کوئی طاقت رہ نہیں جاتی۔ البتہ چھوٹی موٹی جھڑپیں اِدھر اُدھر ہوتی رہتی تھیں۔ ان وجوہات کی بنا پر آزادی کے بعد پہلے دہے میں فرقہ واریت کا زور کم رہا۔

لیکن یہ دور بہت مختصر رہا۔ سماجی اور معاشی تبدیلی نے نئی متصادم قوتوں کو جنم دیا جن کی حلقہ بندی (POLARISATION) ذات پات، طبقاتی اور مذہبی لائنوں پر ہونے لگی تیسری دنیا کے پس ماندہ ممالک میں صنعتی ترقی کی رفتار دھیمی اور غیر متوازن ہوتی ہے اور شدید متصادم طاقتوں کو جنم دیتی ہے۔ ترقی پذیر سماج وادی ملکوں میں بھی ترقی کے عمل کے

ساتھ ساتھ طبقاتی جنگ شدت اختیار کرنے لگتی ہے۔ اور سرمایہ دارانہ نظام میں جکڑے ہوئے پس ماندہ ممالک میں مذہب کی گرفت مضبوط ہونے کی وجہ سے طبقاتی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ذات پات کی جنگ اور فرقہ واریت کی لڑائی بھی تیز ہوتی چلی جاتی ہے اور مؤخرالذکر طاقتوں کو حکمراں طبقے معاشی بحران میں پھنس کر بڑھا وا دیتے ہیں تاکہ طبقاتی شعور فرقہ وارانہ شعور میں بدل جائے اور ظلم و استحصال کا شکار طبقے آپس میں ہی ایک دوسرے سے لڑتے رہیں۔ اس سے طبقاتی جنگ کی شدت کم ہو جاتی ہے۔

تقسیم وطن کے بعد والے دور میں ہندوستان میں فرقہ واریت کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی مضبوط سرمایہ دارانہ طبقہ پیدا نہیں ہو سکا۔ مسلمانوں میں حکمراں طبقے جاگیر دارانہ نظام سے متعلق تھے اور آزاد ہندوستان میں جاگیرداری نظام اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ہندوستان میں سرمایہ دارانہ طبقہ کم و بیش ہندو ہے (اس میں صرف دو بڑے پارسی خاندان شامل ہیں) جہاں تک ہندو سرمایہ داروں کا تعلق ہے، مسلمانوں سے کامپٹیشن کا سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن ترقی کرتی ہوئی معیشت نے۔ اس کی رفتار کتنی ہی کم کیوں نہ رہی ہو۔ مسلمانوں میں درمیانے درجہ کے شہروں میں متوسط درجے کے تاجروں اور صنعت کاروں کا (PETIT BOURGEOIS) طبقہ پیدا کیا۔ ہندوؤں میں بھی ان ہی شہروں میں ایسا ہی طبقہ پیدا ہوا جو ظاہر ہے تعداد میں بہت بڑا ہے۔

آزاد ہندوستان میں فرقہ واریت نے درمیانے درجہ کے شہروں میں جیسے کہ جبل پور، جمشید پور، علی گڑھ، مرادآباد، احمدآباد، گودھرا، الہ آباد، مالے گاؤں وغیرہ میں اپنے قدم جمائے جدید ہندوستان میں فرقہ واریت درمیانے درجے کے شہروں میں پیٹی بورژوا طبقوں کے درمیان معاشی اور سیاسی مقابلے کی پیداوار ہے۔ ہم اس پہلو پر فساد زدہ شہروں کی تحقیقاتی رپورٹوں سے کچھ روشنی ڈالیں گے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ فرقہ واریت سیاسی عوامل سے بھی جمہوری نظام میں شدت اختیار کرتی ہے۔ ہندوستان میں آج ووٹ ذات پات اور مذہب کی بنیاد پر ڈالے جاتے ہیں۔ ہندوستانی سماج آج بھی بڑی حد تک روایت پسند ہے اور اسی لئے یہاں ذات پات اور مذہبی بندھنوں کی خاصی اہمیت ہے۔

ووٹوں کے لئے مختلف سیاسی گروہوں اور جماعتوں میں کامپٹیشن نے ان بندھنوں کو سیاسی اہمیت بخش کر اور بڑھاوا دیا ہے ووٹ سیاسی پروگرام یا ذاتی خوبیوں کی بجائے ذات پات اور مذہبی بنیادوں پر دیئے جاتے ہیں کیوں کہ اس طرح ہر گروہ کو حکمراں جماعت سے اپنے مفادات کا سودا کرنے اور دباؤ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس نے فرقہ واریت کو خوب بڑھاوا دیا ہے۔

جیسے کہ اوپر بتایا گیا جدید ہندوستان میں فرقہ واریت کی بنیاد پیٹی بورژوا طبقوں میں آپسی مقابلے میں ہے۔ دونوں فرقوں کے مفاد پرست اپنے اپنے ہم مذہب افراد کے مذہبی تعصبات اور جذبات کو اُبھار کر خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی مثالیں اس سلسلے میں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

گودھرا جو گجرات کے پنچ محل ضلع میں واقع ہے ۸۱ - ۱۹۸۰ کے درمیان تقریباً ایک سال تک فسادات کا شکار رہا۔ دراصل لڑائی گھانچی مسلمانوں اور سندھیوں کے درمیان تھی۔ دونوں کا تعلق پیٹی بورژوا طبقے سے ہے۔ گھانچی مسلمانوں نے اپنی محنت سے پچھلے کچھ سالوں میں خاصی ترقی کی ہے اور پنچ محل ضلع میں ٹرانسپورٹ کی ان کی اجارہ داری ہے۔ چھوٹی تجارت میں بھی یہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا سیدھا ٹکراؤ سندھی مہاجروں سے ہوتا ہے۔ سندھی بھی چھوٹی تجارتوں پر قبضہ جمانے کی بھرپور کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ گودھرا تیزی سے ترقی کرتا ہوا شہر ہے اور یہاں مکانوں اور زمینوں کے دام بھی تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ سندھی جو باہر سے آئے ہیں مکانوں اور زمینوں کی قلت محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح دونوں فرقوں میں گاہے بگاہے ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے جو اکثر تشدد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔[9]

اگست ۱۹۸۰ء میں مراد آباد میں جو زبردست فرقہ وارانہ فساد ہوا یہ اس بات کا بہت اچھا ثبوت ہے کہ چھوٹے تاجر اور صنعت کار آج فرقہ واریت کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ مراد آباد میں ایک بہت بڑی تعداد دستکاروں کی ہے جو پیتل کا کام کرتے ہیں لیکن اب کچھ دستکار اپنے اپنے کارخانے بنا رہے ہیں اور پیتل کے برتنوں کی تجارت میں بھی ہندوؤں سے مقابلہ کرنے لگے ہیں۔ مراد آباد میں آج تک اس تجارت اور صنعت پر ہندوؤں کی اجارہ داری تھی۔ جتنی اس اجارہ داری کو ضرب لگتی ہے، فرقہ واریت کو بھی اتنا ہی بڑھاوا ملتا ہے۔ علی گڈھ میں بھی کم و بیش یہی عوامل کام کر رہے ہیں۔ یہاں چھوٹے پیمانے پر تالا بنانے کی صنعت بہت مقبول ہے۔ گھر گھر میں تالے بنائے

جاتے ہیں۔ دونوں کمیونٹی کے لوگ غیر قانونی طور پر بجلی استعمال کرنے اور مزدوری کے لئے چھوٹے بچوں کا استحصال کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ آج کل اس میدان میں کچھ بڑے صنعت کار بھی شامل ہو گئے ہیں اور وہ کاٹج انڈسٹری کو ختم کرنے کے لئے فرقہ واریت کا سہارا لیتے ہیں۔ یہاں زمینوں اور گھروں کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور بعض ہندو تاجر مسلمانوں کو بھگانے اور سستے داموں پر مکانوں اور زمینوں کو خریدنے کے لئے فرقہ وارانہ فسادات کا استعمال کرتے ہیں۔ مالے گاؤں میں بھی کچھ اُبھرتی ہوئی ہندو ذاتیں مسلمانوں سے پاورلوم صنعت میں مقابلہ کر رہی ہیں اور یہاں بھی اب فرقہ وارانہ تناؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ پچھلے سال اور اس سال یہاں دو بار فساد ہو چکے ہیں۔

ایسی اور کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن ہم یہ ہرگز نہیں کہنا چاہتے کہ فرقہ وارانہ فسادات کے لئے یہی عوامل ذمہ دار ہیں۔ بہت سے اور بھی عوامل ہیں۔ اسمگلر، دیگر سماج دشمن عناصر، بغیر اجازت ہتھیار بیچنے والے گروہ، بعض صنعتی شہروں میں ہڑتال توڑنے والے غنڈے وغیرہ ہم یہاں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ اگلے مضمون میں بھی ہم ان عوامل پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ ہمیں یہ بات بھی ذہن نشین کرنا چاہئے کہ مذہبی جلوس۔ وہ گنیش کا جلوس ہو یا تعزیوں کا ــ وغیرہ نکالنے سے متعلق جھگڑے مذہبی نوعیت کے نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں اور اس میں سیاسی گروہ اور جماعتیں ہی پیش پیش ہوتی ہیں، مُلّا یا پنڈت نہیں۔

آج کے حالات میں مذہبی تشخص پر بھی اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔ آج ہندو تشخص اور اسلامی تشخص پر زیادہ زور دیا جانے لگا ہے۔ دونوں مذہبی گروہ کے (ELITE) آج اپنے علیحدہ تشخص پر سیاسی اور معاشی فوائد کے پیشِ نظر زیادہ سے زیادہ زور دے رہے ہیں۔ اس کے پیچھے بھی وہی عوامل کارفرما ہیں ہمیں اس کی تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے اس پر ہم کچھ روشنی پہلے بھی ڈال چکے ہیں۔ آج سکھ بھی ہندوؤں سے علیحدہ اپنی شناخت پر زور دے رہے ہیں۔ دراصل اکالی جاٹ کسانوں کے مفادات کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ آج ہندوستان میں دھنی کسانوں اور صنعتی بورژوازی میں مفادات کا ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ جاٹ کسان زرعی پیداوار کی زیادہ قیمت کے طالب ہیں جب کہ صنعتی بورژوازی زیادہ قیمت کے حق میں نہیں ہیں کیوں کہ

اگر زرعی پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ ہو تو شہری مزدوروں کے مہنگائی بھتے میں اور تنخواہوں میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ اکالی فرقہ واریت دراصل سرمایہ داروں اور دھنی کسانوں کے آپسی مفادات کے ٹکراؤ کی پیداوار ہے۔ سکھ (ELITE) بھی اپنے مفادات کے لئے فرقہ واریت کا سہارا لے رہے ہیں۔

ستمبر ۱۹۸۲ء

ہندوستانی مسلمانوں کی سامراج دشمن روایات

ہندوستان ۱۹ویں صدی کے شروع سے ہی برطانوی سامراج کے چنگل میں پھنس چکا تھا یہ صحیح ہے کہ یہ عمل ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف مرحلوں سے گذر رہا تھا۔ جیسے جیسے ملک پر سامراج کی پکڑ مضبوط ہوتی گئی۔ یہاں کے عوام کا غم و غصہ بھی اس کے خلاف بڑھتا گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا ردِّ عمل برطانوی سامراج کے خلاف خصوصًا زیادہ شدید تھا جس کی وجہ ظاہر ہے۔ برطانوی سامراج کا سیدھا ٹکراؤ مسلمانوں کے حکمراں طبقے سے ہوا جنوبی ہند میں ٹیپو نے برطانوی سامراج سے لوہا لیا تو شمالی ہند میں علماء نے یہ فرض ادا کیا۔ اسمٰعیل شہید کی تحریک کو بھی اسی زمرے میں شامل کرنا چاہیئے۔

مشرقی ہندوستان میں جب برطانوی سامراج کی گرفت مضبوط ہونے لگی تو وہاں بھی وہابی تحریک نے زور پکڑا۔ بنگال میں اس تحریک کو فرائضی تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ شروع میں اس تحریک کا زور مذہبی فرائض پر تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس نے معاشی اور سیاسی صورت اختیار کرلی۔ اس دوسرے مرحلے میں اس تحریک میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو کسان بھی شریک ہوگئے اور تحریک کا رُخ ان زمینداروں کے خلاف ہوگیا جو برطانوی رعیت واری نظام کے تحت وجود میں آئے تھے۔

چنانچہ کنور محمد اشرف اپنے ایک انگریزی مضمون (MUSLIM REVIVALISTS AND

REVOLT) میں رقم طراز ہیں،

"بنگال کے فرائضی مسلم احیار پرستی کی تحریک میں زرعی انقلاب کے رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فرائضی تحریک برطانوی حکومت کے (PERMENENT SETTLEMENT) کے نتیجے میں ابھری جو ۱۷۹۳ء میں لاگو کیا گیا تھا۔ برطانوی معاشی پالیسی جس کے تحت پرانے مسلم زمیندار برباد ہوگئے اور بنگال کے دستکار بھی جس کے نتیجے میں ڈھاکہ کی آبادی ایک لاکھ پچاس ہزار سے گھٹ کر صرف ۲۰ ہزار رہ گئی۔ فرائضی بغیر معاوضہ دیئے زمینداروں کی ملکیت پر قبضہ کر لینے پر زور دیتے تھے"۔

شریعت اللہ فرید پوری نے ۱۸۰۴ء میں فرائضی تحریک کی بنیاد رکھی اور کسانوں کے اتحاد پر زور دیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے دو دو میاں نے اس تحریک کو اور آگے بڑھا دیا۔ دو دو میاں سید احمد بریلوی کے ۱۸۳۱ء میں چلائے گئے سکھوں کے خلاف جہاد سے متاثر تھے ۔ دو دو میاں نے اپنے والد سے ایک قدم آگے بڑھایا اور یہ نعرہ لگایا کہ خدا کی زمین پر ٹیکس لگانے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ دو دو میاں نے دیہاتوں میں عدالتیں قائم کر رکھی تھیں اور اگر کوئی برطانوی عدالت میں مقدمہ لے جاتا تھا تو اس کا سخت سماجی بائیکاٹ کیا جاتا تھا۔

فرائضی ہندو اور مسلم جاگیرداروں کے گھروں پر یکساں طور پر حملے کرتے تھے اور اس میں کسی قسم کی جانبداری نہیں برتی جاتی تھی۔ فرائضی تحریک میں تقریباً ۸۰ ہزار نچلے طبقے کے لوگ شامل ہو گئے تھے۔ دو دو میاں ۲۴ پرگنہ، نادیا اور فرید پور میں بہت فعال تھے اور ۱۸۴۱ء ۱۸۴۴ء اور ۱۸۴۶ء میں مسلح کسانوں کی بغاوت کرائی۔ ۱۸۵۷ء میں برطانوی حکومت نے انھیں گرفتار کر لیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فرائضی تحریک بنیادی طور پر سامراج دشمن تحریک تھی جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک نیا سیاسی شعور بخشا۔

شمالی ہند میں بھی وہابی تحریک یوں تو ایک مذہبی تحریک تھی لیکن دراصل اس کا سیدھا ٹکراؤ برطانوی سامراج سے تھا۔ وہابی تحریک دراصل شاہ ولی اللہ کی روایتوں کی پروردہ تھی اور ابتدا سے ہی اس کا رخ سامراج واد کے خلاف تھا۔ مذہبی علمار کا سامراج واد کے خلاف

تحریک میں حصہ لینا کوئی نئی بات نہیں تھی، انڈونیشیا میں بھی سامراجی حکومت کے خلاف علما نے راہ نمائی کی تھی اور ۱۹ ویں صدی میں سوڈان کے مہدی کا قصہ کون نہیں جانتا۔ برطانوی سامراج وادیوں نے مہدی پر مذہبی جنون کا الزام لگایا تھا کیوں کہ وہ برطانوی سامراج کے مفادات کو گہری چوٹ پہنچا رہے تھے۔ خود ہمارے دور میں ایران میں آیۃ اللہ خمینی نے امریکی سامراج کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور اسے شکست فاش دی۔

بہر حال ۱۹ ویں صدی میں شمالی ہند میں وہابی علماء نے برطانوی سامراج کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔ مولانا قاسم نانوتوی نے انگریزوں کے خلاف کئی علماء سے فتوے حاصل کر کے انہیں نصرت الاحرار کے نام سے شائع کیا۔ اس مجموعہ میں سٹو فتاوی تھے۔ اور ان فتاویٰ میں متفقہ طور پر برطانیہ کے زیر حکومت ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا گیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے اس سے بھی پہلے دار الحرب کا فتویٰ صادر کر دیا تھا۔ دار الحرب میں مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ حاکموں کے خلاف جہاد کریں۔ یہاں سے ہجرت کر کے کسی آزاد مسلم ملک میں چلے جائیں۔

غدر کے دوران نہ صرف وہابیوں نے برطانوی حکومت سے ٹکر لی اور عظیم قربانیاں پیش کیں بلکہ دوسرے مسلمانوں نے بھی برطانوی حکومت کے خلاف جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ بات بڑی دلچسپ اور نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب باغیوں نے دہلی میں اپنی حکومت قائم کی تو ہندو عوام کا احترام کرتے ہوئے گاؤ کشی پر پابندی عائد کر دی۔ اور ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے مغلیہ سلطنت کی بہت سی روایتوں کو قائم رکھنے کا اعلان کیا مثال کے طور پر نانا صاحب جو ہندو باغیوں کے لیڈر تھے اعلان کیا کہ وہ مغلیہ سلطنت کی تمام علامتوں کو قائم رکھیں گے۔ مثلاً قمری کلینڈر کا استعمال سرکاری دستاویزات پر بسم اللہ لکھنا اور جمعہ کو عام تعطیل دینا وغیرہ۔

ہندوستان کی جنگ آزادی کے دوران بھی ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی سامراج دشمن روایت کو قائم رکھا۔ علماء اور خصوصاً نچلے طبقے کے مسلمان ہمیشہ برطانوی حکومت کے خلاف لڑتے رہے اور کبھی مفاہمت کی بات نہیں کی۔ خلافت تحریک جس کا اصل نشانہ

برطانوی حکومت تھی اسے محض مذہبی تحریک سمجھنا غلط ہوگا۔ دراصل اس تحریک کا اصل مقصد برطانوی حکومت کو ختم کرنا تھا۔ اس تحریک کے شباب کے دور میں ہزاروں مسلمانوں نے افغانستان کی طرف ہجرت کی اور وہاں کچھ ہندو دوستوں کے ساتھ ملکر عبوری حکومت بھی قائم کی۔ کچھ لوگ افغانستان ہوتے ہوئے روس تک پہنچ گئے۔ اور ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب سے متأثر ہوکر آئے۔ روسی انقلاب سے متأثر ہونے والوں میں مولانا عبیداللہ سندھی کا نام بڑا نمایاں ہے۔ موصوف نے روسی انقلاب کی حمایت میں کئی مضامین لکھے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سوشلسٹ اقدار اور اسلامی اقدار ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی، شاہ ولی اللہ کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے خصوصًا شاہ ولی اللہ کی شاہکار تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کی اہمیت کو جتایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ولی اللہ صاحب ہندوستانی مسلمانوں کے مارکس تھے۔

جہاں ہندوستانی مسلمانوں کی سامراج مخالف روایت کا ذکر آئے گا وہاں بھلا حسرت موہانی کو کون بھول سکتا ہے۔ مولانا راسخ العقیدہ مسلمان تھے لیکن ساتھ ساتھ کمیونسٹ ہونے پر بھی فخر کرتے تھے۔ خود مولانا سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون میں حسرت موہانی کا بڑے احترام سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا اس بات پر اصرار فرماتے تھے کہ لفظ سوویت (SOVIET) دراصل عربی لفظ سَوِیَت سے نکلا ہے جس کے معنٰی برابری کے ہیں اور یوں حسرت موہانی کمیونزم کا رشتہ اسلام سے جوڑ دیتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ حسرت موہانی نے ہی سب سے پہلے مکمّل آزادی کی مانگ کی۔ ۱۹۲۲ کے احمد آباد کانگریس اجلاس میں مولانا نے ہوم رول کی مخالفت کرتے ہوئے مکمّل آزادی کی قرارداد پیش کرنا چاہی۔ مہاتما گاندھی بھی اس وقت تک مکمّل آزادی کی بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے برسوں برطانوی حکومت کے جیلوں کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن کبھی مفاہمت کرنا گوارا نہیں کیا۔

خان عبدالغفار خان اور اُن کی خدائی خدمت گاروں کے رول کو بھلا کون فراموش کرسکتا ہے۔ خدائی خدمت گار اپنے دور کی ایک زبردست سامراج دشمن قوت تھی۔

یہاں پنجاب کے احرار کا ذکر کرنا بھی بے حد ضروری ہے۔ آج مسلمانوں کی نئی نسل احرار کی تحریک سے بالکل واقف نہیں ہے۔ احرار سرمایہ داری اور سامراجیت کو اسلام کا بنیادی دشمن سمجھتے تھے۔ چنانچہ احرار کے ایک اہم لیڈر چودھری افضل حق احرار کے حامیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"احرار دوستو! اپنے ایمان کو مضبوط رکھو، جماعت کی وفاداری کو مقدم سمجھو، کوئی تمہیں سرمایہ دار لیگ (مسلم لیگ) کا ایجنٹ بن کر لیگ کی طرف بلائے گا۔ کوئی سرمایہ دار کانگریس کا ایجنٹ کانگریس کی دعوت دے گا۔ سب کی سن کر جماعت سے وفادار رہو۔ سرمایہ داری کے خطرے کو پہچانو، غریبوں کو سرمایہ داروں کی غلامی سے بچاؤ۔ انسانیت کو چھوت کی لعنت سے نجات دلاؤ۔"

انہی دنوں چودھری افضل حق نے کتنی سچ بات کہی تھی کہ "کانگریس کی محنت اور قربانی کا نتیجہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی حکومت انگریزی سرمایہ داروں کے ہاتھوں سے نکال کر ہندوستان کے سرمایہ داروں کے ہاتھ دی جائے بلکہ ڈومینن اسٹیٹس (DOMINION STATUS) کی شکل میں تو جو حکومت ہندوستان پر قائم ہوگی اس میں ہندوستانی اور انگریز سرمایہ دار مل کر یہاں کے غربار کو کچلنے کی کوشش کریں گے۔"

ہندوستان میں مسلمانوں کی سامراج مخالف روایت کی تاریخ بہت طویل ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں تو ہم اس کا ہلکا سا خاکہ ہی پیش کر سکتے ہیں۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج جنگِ آزادی کی تاریخ میں جتنی اہمیت مسلم لیگ کی تحریک کو دی جاتی ہے اتنی اہمیت ان مسلم جماعتوں اور تنظیموں کی تاریخ کو نہیں دی جاتی جنہوں نے برطانوی سامراج سے کبھی کوئی مفاہمت نہیں کی۔ مسلم لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں تھی۔ جمعیتہ العلماء، احرار، مومن برادری، خدائی خدمت گار، اور ایسی کئی جماعتیں جو مسلمانوں کے نچلے طبقوں اور محنت کش عوام کی نمائندگی کرتی تھیں ان کی سامراج دشمن اور ملک کی آزادی کی جدو جہد کو نمایاں مقام دینا تو دور کی بات ہے ان کا ذکر تک آزادی کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ بورژوا تاریخ دانوں سے ہم اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔ ——

اکتوبر ۱۹۸۲ء

علی گڑھ کی خوں ریزی

(اکتوبر ۱۹۷۸ء)

ترقی پسند لیڈروں کے لیے چیلنج

علی گڑھ کے حالیہ فسادات نے جو ۵ار اکتوبر سے شروع ہوئے اور ابھی تک جاری ہیں سارے ملک کو چونکا دیا ہے۔ اس فساد کو علی گڑھ کا مقامی واقعہ سمجھنا ہماری سیاسی کم مائگی کا ثبوت ہوگا بلا مبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ علی گڑھ کا یہ فساد ملکی سیاست میں نیا اور خطرناک موڑ ہے۔ ایسا ہی موڑ جیسا ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کا احمد آباد اور بھیونڈی کا فساد اُس وقت ملک کی سیاست کے لیے ثابت ہوا تھا۔

احمد آباد سے علی گڑھ تک ہمارا ملک مختلف سیاسی بحرانوں سے دوچار رہا۔ احمد آباد کا فساد فرقہ پرستوں نے اُس وقت برپا کیا تھا جب ملک کی سیاست ایک اہم موڑ لے رہی تھی۔ بینکوں کو قومیانے کے فیصلے نے ملک میں ایک نیا سوشلسٹ شعور پیدا کر دیا تھا اور رجعت پسند طاقتیں اس سماجی شعور کو فرقہ پرستی کا زہر پلا کر ختم کر دینا چاہتی تھیں۔ لیکن یہ زہر ہمارے ملک کے گلے کے نیچے نہیں اُترا۔ اور اس لیے کم ازکم اس وقت اس کی رگ و پے میں نہیں پھیل سکا۔

لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ زہر کی پوٹلی اس کے گلے میں اب بھی اٹکی ہوئی ہے اور موقع ملتے ہی یہ ملک کی رگ و پے میں سرایت کر سکتی ہے اور وہ موقع سامنے ہی نظر آرہا ہے۔ اب صورتِ حال زیادہ خطرناک اس لیے نظر آرہی ہے کہ اس ملک کی سب سے اہم فرقہ پرست جماعت آر۔ ایس۔ ایس کے نظریات کی حامی جن سنگھ حکمراں جنتا پارٹی کا جزو ہے۔ اور آر۔ ایس۔ ایس سے تعلق رکھنے والے

سیکڑوں افراد مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ ہم نے ایک مضمون کے ذریعے ایمرجنسی کے فوراً بعد قارئین کو اس خطرے سے آگاہ کیا تھا اور امیر جماعت اسلامی کے اس بیان پر کڑی تنقید کی تھی کہ آر ایس ایس میں اب نظریاتی تبدیلی آگئی ہے اور جماعت اسلامی اس کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے تیار ہے تبدیلی کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ آر ایس ایس اور جماعت کے لیڈر جیلوں میں ایک دوسرے کے قریب آئے اور عید دیوالی وغیرہ تہوار مل جل کر منائے جس سے آپسی غلط فہمیاں دور ہوگئیں۔

دراصل وہ لوگ فرقہ پرستی کے سیاسی زہر کو سمجھ ہی نہیں سکتے جو اُسے ہندو مسلمانوں کی آپسی غلط فہمی تک محدود سمجھتے ہیں اور مل جل کر چند تہوار منا لینے میں اس زہر کا تریاق تلاش کرتے ہیں اسے سیاسی سادہ لوحی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے دراصل آر ایس ایس کی فرقہ پرستی ہندوستانی سیاست کو رجعت پرستی کے اطراف ڈھکیلنے کی ایک گہری سازش ہے اور ہر وہ طاقت اس کا ساتھ دیتی ہے جو ہمارے سماج میں ایک بامعنی تبدیلی کی مخالف ہے اور سماجی انصاف پر مبنی صحت مند معاشرے کے قیام کی پرخلوص کوششوں کو سبوتاج کرنا چاہتی ہے۔ کئی آر۔ ایس۔ ایس کے اہم لیڈر انفرادی طور پر مسلمانوں سے ذاتی تعلقات رکھتے ہیں۔ اور شاید انفرادی طور پر مصیبت کے وقت میں ان کی مدد بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ بالکل انفرادی سطح کی بات ہے۔ اس سے ان کے رجعت پرست سیاسی نظریات اور فرقہ پرست سیاست کا کوئی تعلق نہیں ہے آج ہندوستان میں ترقی پسند طاقتوں اور سیکولر حکومت کے حامیوں کو سیاسی سطح پر ہی اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ جماعت اسلامی کو بھی رجعت پرستی کے الزام سے بری نہیں کیا جا سکتا اور دراصل یہ مقابلہ ترقی پسند طاقتوں اور رجعت پرست طاقتوں کا مقابلہ ہوگا۔ سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے یہ بات اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔

علی گڑھ کا فساد خطرے کی پہلی گھنٹی ہے۔ یہ فساد دراصل آر۔ ایس۔ ایس کی کھلی سازش کا نتیجہ ہے۔ جنتا پارٹی نے جو اپنی تحقیقاتی ٹیم علی گڑھ بھیجی تھی اس کے تینوں ممبروں نے جنتا پارٹی کے صدر کو جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں متفقہ طور پر آر۔ ایس۔ ایس کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ اس کمیٹی کے ایک ممبر جناب عبدالحمید رحمانی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "یہ فساد دراصل فرقہ پرست

آر۔ایس۔ایس کا پروونشیل آرمڈ کانسٹیبلری اور پولیس کی مدد سے مسلمانوں پر یک طرفہ حملہ تھا" رحمانی صاحب نے یہ بات اپنے اس خط میں کہی ہے جو انہوں نے جنتا پارٹی کے صدر چندر شیکھر کو لکھا ہے۔

چندر شیکھر ویسے ترقی پسند اور سیکولر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن بُرا ہو موقع پرست سیاست اور اقتدار کی ہوس کا کہ انہوں نے آرایس ایس کو علی گڑھ کے فساد سے بری الذمہ قرار دے دیا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ جنتا پارٹی کی آپسی لڑائیوں میں جن سنگھ اور آرایس ایس چندر شیکھر اور مرارجی کا ساتھ دے رہے ہیں اور اپنی کرسیٔ صدارت سنبھالے رکھنے کے لئے چندر شیکھر صاحب کو اس حمایت کی بڑی ضرورت ہے اس لیے آرایس ایس کو خوش کرنے کے لیے اپنی ترقی پسندی اور سیکولر امیج کی پرواہ کیے بغیر فساد کی ذمے داری سے اُسے بری کر دیا۔

دوسری طرف بہوگنا کی خاموشی بھی بڑی پُراسرار معلوم ہو رہی ہے۔ بہوگنا کو یوپی کے مسلمانوں کی زبردست حمایت حاصل ہے بلکہ مسلمانوں کی یہ حمایت ہی ان کا سیاسی سرمایہ ہے۔ اس وقت ان کی یہ خاموشی ان کے سیاسی مستقبل کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ جنتا پارٹی میں ان کی بھی وہی مجبوری ہو سکتی ہے۔ جو چندر شیکھر کی ہے خیر ہم اصول کی بات تو نہیں کریں گے کیونکہ عام طور پر سیاست اور اصولوں کا جوڑ مشکل ہی سے بیٹھتا ہے لیکن صرف عملی سیاست کے نقطۂ نظر سے بھی بہوگنا کی یہ خاموشی ان کے سیاسی مفاد میں نہیں ہے۔ علی گڈھ میں مسلمانوں کا یہ یکطرفہ قتلِ عام معمولی سانحہ نہیں ہے جو یونہی نظر انداز کیا جا سکے۔

میں نے اسے ہندوستانی سیاست میں ایک نیا موڑ اسی لیے کہا ہے کہ اس کی وجہ سے کل ملک کی سیاست کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ ہندوستانی سیاست کا ہر طالب علم یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ مرکز میں کسی بھی حکمراں جماعت کے لیے ہریجنوں اور مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اسی لیے جنتا پارٹی نے اپنے سیاسی منشور میں جن سنگھ کی شمولیت کے باوجود ہریجنوں اور مسلمانوں کی شکایتیں رفع کرنے کا خاص طور سے وعدہ کیا تھا۔

اندرا گاندھی چک مگلور کا چناؤ جیت چکی ہیں اور اس جیت میں بھی ہریجنوں اور مسلمانوں کی حمایت کو خاص دخل رہا ہے۔ وہ ہندوستان کے سیاسی افق پر پھر ایک نئی طاقت بن کر ابھر رہی ہیں۔ حالانکہ شمالی ہندوستان کے مسلمان ایمرجنسی کے مظالم کو ابھی نہیں بھولے ہیں۔

لیکن آر۔ایس ایس کا کھلم کھلا اس طرح فساد کی آگ کو بھڑکانا وہ کب تک برداشت کریں گے۔ اگر خدانخواستہ مسلمانوں نے شمالی ہندوستان میں بھی اندرا گاندھی کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کرلیا تو جنتا پارٹی ہرگز برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتی۔ اور اقتدار کی باگ ڈور پھر مطلق العنان طاقتوں کے ہاتھ میں جاسکتی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ فسادات اندرا گاندھی کی حکومت میں بھی ہوئے اور وہ اقتدار میں آئیں تو آئندہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن کم ازکم مسلمانوں کو نفسیاتی طور پر یہ تسلی ہوتی ہے کہ وہ فرقہ پرست جماعتوں پر اپنی تقریروں میں کھلم کھلا حملہ کرتی ہیں اور اقلیتوں کو حفاظت کا یقین دلاتی ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ یہ بھی ایک سیاسی حربہ ہوتا ہے۔ اقلیتوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے۔

جن سنگھ جنتا پارٹی کا ایک نہایت ہی اہم جزو ہے اور جن سنگھ کا سیاسی ورکر آر ایس ایس سے بھرتی ہوتا ہے۔ جنتا پارٹی میں شامل دوسری سیاسی سیکولر پارٹیاں کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں جس سے جن سنگھ ناراض ہو جائے۔ پارٹی دستور بناتے وقت جب مدھو لیمے وغیرہ نے دُہری ممبر شپ (ایک ہی وقت میں جنتا پارٹی اور آر ایس ایس کی ممبر شپ) پر اعتراض کرتے ہوئے اسے ممنوع قرار دینے پر زور دیا اور پارٹی کانسٹی ٹیوشن میں ایسی ایک شق شامل کرنے کے لیے اصرار کیا تو شری واجپائی نے حکومت اور پارٹی سے استعفا دینے کی دھمکی دے کر انہیں خاموش کر دیا اور دوہری ممبر شپ کے خلاف کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس بات سے ہم اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ موجودہ حکومت میں۔ آر ایس ایس کو کتنی اہمیت حاصل ہے اور چندر شیکھر اور بہوگنا کا رویہ بھی صاف اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ اس دیو ہیکل کو چھیڑنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آر۔ ایس۔ ایس بڑی تیزی سے اس وقت اپنا جال پھیلانے میں مصروف ہے۔ اور اب اسے یہ کام پہلے کی طرح ڈھکے چھپے اور خاموشی سے بھی کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس جنوبی ہند میں کرناٹک، آندھرا پردیش اور کیرل میں تیزی سے اپنا جال پھیلا رہی ہے اور پہلی مرتبہ بنگال سے پرے آسام اور میزورم وغیرہ میں بھی گھسنے کی کوشش کر رہی ہے پہلے جنوب میں آر۔ ایس۔ ایس کا اثر بہت کم تھا اور مشرق میں تو اس کی طاقت صفر کے برابر ہی تھی۔

آج اُن علاقوں میں داخل ہو کر اپنے کام کی بنیاد ڈالنا آر۔ ایس۔ ایس کی نئی دریافت کردہ جرأت کا پتہ دیتا ہے۔

اس کی یہ جرأت اس کے اخباروں سے بھی ظاہر ہو رہی ہے پہلے نو جن سنگھ نے ۱۹۶۸ میں ہندوستانی مسلمانوں کو ہندیانے INDIANISATION، کا نعرہ لگایا تھا لیکن اب یہ اپنی صورت بدل کر ہندوانے (HINDUISATION) کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ۲ ار ستمبر ۱۹۷۷ کے شمارے میں "آرگنائزر" نے اداریہ میں لکھا ہے کہ "ہندوستان کی ہر تنظیم غیر شعوری طور پر غیر ہندوؤں کو ہندوانے کا کام کرتی ہے"۔ علی گڈھ فساد سے ایک ہفتہ پہلے ہی مدراس سے اپنے ایک بیان میں دیورس صاحب نے کہا تھا کہ ساری دنیا کے ہندو متحد ہو جائیں اور یہ بھی کہ فرقہ وارانہ فساد اسی صورت میں رو کے جا سکتے ہیں کہ ہندو طاقتور ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں دیورس صاحب جو آر۔ ایس۔ ایس کے منتظم اعلیٰ ہیں، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اپنا حق مت جتاؤ اور اپنے شہری حقوق سے دستبردار ہو کر ہندوؤں کی متحدہ طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دو۔ ہندوستان جیسی سیکولر جمہوریت میں اس سے بڑھ کر لغویات کیا ہو سکتی ہے؟

چاہے دیورس نے علی گڈھ کے آر۔ ایس۔ ایس لیڈر مسٹر نومان سے یہ فساد برپا کرنے کے لیے نہ کہا ہو لیکن اس قسم کی تقریریں مقامی آر۔ ایس۔ ایس لیڈروں کے لیے مسلمانوں کی جمہوری طاقت ختم کرنے کا کھلا اشارہ نہیں تو اور کیا ہے۔ یقیناً کوئی لیڈر صاف لفظوں میں یہ تو ہرگز نہیں کہے گا کہ مسلمانوں، ہریجنوں یا دوسری اقلیتوں کا قتل عام کرو۔ کوئی اس طرح کی قانونی گرفت میں نہیں آنا چاہے گا۔ لیکن اپنے لیڈر کی اس قسم کی تقریر براہِ راست اقلیتوں کے خلاف اشتعال انگیزی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی بات ۱۹۶۹ء میں احمد آباد میں بھی ہوئی تھی۔ گرو گولوالکر نے احمد آباد جاکر اسی قسم کی تقریر کی اور چند دنوں کے اندر فساد شروع ہو گیا۔ کیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) کے لیڈر ہری کشن سنگھ سرجیت جو بذات خود تحقیقات کے لیے علی گڈھ گئے تھے اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ "علی گڈھ میں فساد کا التزام نہ صرف مسلمان بلکہ تمام سیکولر اور جمہوریت نواز طاقتیں آر۔ ایس۔ ایس کے سر رکھ رہی ہیں۔ یہاں ایک مسلم یونیورسٹی کا وجود شروع سے آر۔ ایس۔ ایس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا ہے

جنتا پارٹی کی الیکشن میں جیت اور کچھ چوٹی کے افسروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے بعد آر۔ایس۔ایس اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت سمجھنے لگی ہے۔"

ہری کشن سنگھ سرجیت نے اپنی اس رپورٹ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے والے ان تمام واقعات کا ذکر کیا ہے جن کو پڑھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک بوڑھے باپ کے سامنے اس کے جوان بیٹے کو، جس کی شادی کچھ دنوں پہلے ہی ہوئی تھی، زندہ جلا دیا گیا۔ اس کا باپ پاگل ہو گیا ہے اور اپنے بیٹے اور بہو کی تصویریں لے کر گھومتا پھرتا ہے۔ اسی طرح ایک بڑھیا کو اس کے بیٹے کے سامنے جلا دیا گیا۔ زندہ جلا دینے کے ایسے کئی واقعات پیش آئے ہیں۔ نومان، جو مقامی آر۔ایس ایس کا لیڈر اور علی گڑھ جنتا پارٹی کا صدر ہے، کھلم کھلا اپنے ساتھیوں کے ساتھ آزادی کے ساتھ گھوم رہا تھا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ حکام نے اسے گرفتار بھی کیا تو۔۔۔آر۔ایس۔ایس سے تعلق رکھنے والے منسٹر کے کہنے پر اسے دوسرے دن چھوڑ دیا گیا۔

ہم یہاں فساد کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے۔ یہ تفصیل مختلف رسالوں میں چھپ چکی ہے۔ ہم یہاں صرف اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ اقلیتوں نے پچھلے لوک سبھا چناؤ میں جنتا پارٹی پر اعتماد کیا اور اسے برسرِ اقتدار لانے میں اہم رول ادا کیا۔ لیکن آر۔ایس۔ایس کا یہ خطرناک رول ہریجن، مسلمان اور دوسری اقلیتیں ہرگز برداشت نہیں کر سکتیں۔ اس ملک کی سیکولر طاقتیں ان اقلیتوں کے ساتھ ہیں اور ممکن ہے کہ ان طاقتوں کو نئے سرے سے اپنے آپ کو منظم کرنا پڑے۔ تاکہ فرقہ پرستی کی لعنت کو کچلا جا سکے۔ اگر سیکولر طاقتوں نے نئے سرے سے اپنے آپ کو منظم نہیں کیا۔ اور اس نئی تنظیم میں بائیں بازو کی جماعتیں خاص طور سے اہم رول ادا نہ کریں گی۔ تو یہ ملک یا تو آر۔ایس۔ایس جیسی خطرناک فرقہ پرست جماعت کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا یا اندرا گاندھی جیسی مطلق العنان طاقت کے زیرِ نگر ہو کر رہے گا۔ اور یہ دونوں صورتیں اس کے لیے خطرناک ثابت ہوں گی۔ اس سے بڑھ کر بائیں بازو کی طاقتوں کے لیے اور کون سا چیلنج ہو سکتا ہے۔

(اکتوبر ۱۹۷۸ء)

علی گڈھ

آنکھوں دیکھی اور تحقیقاتی رپورٹ

پہلے بھی میں علی گڈھ کے فساد کے سیاسی پہلو پر اور اس فساد میں آر۔ایس۔ایس کی شمولیت پر لکھا جاچکا ہے۔ جیساکہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا علی گڈھ کا یہ فساد ہندوستانی سیاست میں ایک نیا موڑ ثابت ہوسکتا ہے۔ (ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ ہوگا، ویسے سیاست میں قطعیت کے لیے اتنی گنجایش نہیں ہوتی) اور اسی لیے اس پر میں دوبارہ قلم اٹھا رہا ہوں۔ اگر جنتا پارٹی کے سیاستداں اب بھی معاملہ فہمی کا ثبوت دیں اور تحقیقات سے سامنے آنے والے واقعات سے سبق حاصل کریں (جنتا پارٹی کے سیاستداں ایسا کریں گے اس کا مجھے یقین نہیں رہا) تو حالات پر اب بھی قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایمرجنسی میں اندرا گاندھی کی طرح انہیں عقل اسی وقت آئے گی جب بہت دیر ہوچکی ہوگی۔

بہرحال جو کچھ بھی ہو میں اس مضمون کے ذریعے اپنے قارئین کو علی گڈھ فساد کے متعلق چند ان واقعات سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو (پیپلز یونین فار سول لبرٹیز [illegible]) یعنی عوامی انجمن برائے جمہوریت) کی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں پیش کیے ہیں اور جو عام طور پر اخباروں میں نہیں چھپے ہیں۔ اس تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ پر کسی سیاسی

جماعت کی حمایت یا مخالفت کا الزام عائد کرنا مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تحقیقاتی ٹیم نے اپنی چھان بین کے دوران ہر جماعت اور گروہ، چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی، مسلم دشمن ہو یا مسلم دوست، فرقہ پرست ہو یا سیکولر، سے بات چیت کی ہے اور ان کی رائے معلوم کی ہے۔ اس تحقیقاتی ٹیم میں دو شخص شامل تھے (۱) مُکندن۔سی مینن اور (۲) سومینتا بینر جی۔ چونکہ یہ دونوں حضرات غیر مسلم ہیں اس لیے ان پر مسلمانوں کی بیجا حمایت کا بھی الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ اس تحقیقاتی کمیٹی نے اکتوبر ۲۱ اور ۲۲ کو علی گڈھ کے گلی کوچوں میں گھوم کر واقعات دیکھے، سنے اور جمع کئے ہیں، اس وقت فساد کا دوسرا مرحلہ شروع نہیں ہوا تھا۔

تحقیقاتی کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ فساد کی آگ بھڑکانے میں ہندو فرقہ پرستوں کا ہاتھ تھا اور ہندو فرقہ پرستوں کی اگوائی آر۔ایس۔ایس اور جنتا پارٹی کے مقامی صدر مسٹر کرشن کمار نومان کر رہے تھے۔ فساد بالکل یکطرفہ تھا یعنی اس میں کہیں کسی مسلم فرقہ پرستوں کو موردِ الزام نہیں کیا جا سکتا۔ بھورے پہلوان جس کے قتل سے فساد کی شروعات ہوئی، علی گڈھ کے مقامی سماج دشمن عناصر میں شمار ہوتا تھا اور سیما ٹاکیز کے مالک اسے سینما کے آس پاس امن قائم رکھنے کے لیے پیسہ دیتے تھے۔ اس پر حملہ کرنے والوں میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے (۲ مسلمان تھے) اور اس پر یہ حملہ غنڈوں کے دو گروہوں میں ذاتی دشمنی کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ اس قتل میں فرقہ پرستی یا مذہبی دشمنوں کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ فساد کی شروعات کے لیے دراصل اسے بہانہ بنایا گیا۔ تحقیقاتی کمیٹی اس نتیجے پر کافی غیر جانبدارانہ چھان بین کے بعد پہنچی ہے۔

ہندو مسلم تناؤ کے سلسلے میں ایک اہم بات۔ جس کی طرف دوسروں نے اشارہ نہیں کیا علی گڑھ یونیورسٹی بل سے متعلق ہے۔ جنتا پارٹی نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال کرنے کے سلسلے میں پارلیامنٹ میں ایک بل پیش کیا ہے۔ علی گڈھ میں پچھلے جون کے مہینے سے اس بل کو لیکر ہندو فرقہ پرستوں میں خاصی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ انہیں یہ بات ہرگز گوارا نہ تھی کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو بحال کیا جائے۔ اگست میں اس سلسلے میں

ایک عام جلسہ کیا گیا جس کی صدارت شیو ہری سنگل جو پہلے جن سنگھ کے اور اب جنتا پارٹی کے مقامی لیڈر رہیں اور وکالت کرتے ہیں نے کی۔ اس جلسے میں بل کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کی گئیں۔ جو لوگ اس جلسے میں شریک تھے اُن کا کہنا ہے کہ بعض مغروروں نے اپنی تقریر میں یہ دھمکی دی کہ اگر یہ مجوزہ بل پاس ہو گیا تو "علی گڈھ کو دوسرا مراٹھواڑہ بنادیا جائے گا"۔ پی۔ یو سی۔ ایل کی تحقیقات کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق اس بات کی تصدیق ہندوؤں اور مسلمانوں سبھی نے کی کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی بل کو لیکر ہندو فرقہ پرستوں میں کافی اشتعال پایا جاتا تھا۔ ٹیم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے تدریسی عملے کے دو ہندو ممبر، جو ۵ اکتوبر کے فساد میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، ایک عرصے سے علی گڈھ میں ایک دوسری یونیورسٹی کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے تھے، جس کا کردار "سیکیولر" ہوگا۔ مقامی جنتا پارٹی کے صدر (اور مقامی آر۔ ایس۔ ایس کے سرگرم کارکن) مسٹر کرشن کمار نومن نے بھی اس بات پر زور دیا کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا کردار تفریق پیدا کرنے والا ہے۔ ان کے مطابق علی گڈھ کی آبادی ۶۰ فیصد ہندو (۴۰ فیصد اعلیٰ ذاتیں اور ۲۰ فیصد نچلی ذاتیں) اور ۴۰ فیصد مسلمان ہیں۔ اس لیے یونیورسٹی کی موجودہ ساخت میں زبردست تبدیلی کی ضرورت ہے۔

تحقیقاتی کمیٹی کی چھان بین سے فرقہ وارانہ تناؤ کی ایک اور وجہ پر روشنی پڑتی ہے۔ مانک چوک۔ جہاں ۵ اکتوبر کو فساد کی شدت سب سے زیادہ تھی ـــ کے مسلمانوں سے بات چیت کرنے پر ٹیم اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مانک چوک کے ہندو وہاں سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے ایک عرصے سے کوشش کر رہے تھے۔ مانک چوک کے اُن علاقوں میں جہاں ہندوؤں کی بھاری اکثریت ہے مسلمانوں کے مشکل سے ۱۰ یا ۱۵ مکان ہیں۔ مانک چوک آر۔ ایس۔ ایس کا علاقہ ہے۔ کرشن کمار نومن کا مکان بھی مانک چوک ہی میں ہے۔ مانک چوک کے ان مسلمانوں کا جو، فرقہ وارانہ فساد کا شکار ہوئے، کہنا ہے کہ فساد سے پہلے آر۔ ایس۔ ایس کے کچھ افراد نے انھیں یہ دھمکی دی تھی کہ وہ اپنے مکان چھوڑ کر چلے جائیں ورنہ ہلاکت خیز نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہیں۔ مانک چوک میں رہنے والے مسلمان یا تو پھل بیچنے والے، یا بینڈ باجے والے یا چھوٹے موٹے کارخانوں میں کام کرنے والے ہیں۔ اور ۵ اکتوبر کو بھی حملہ آوروں کا نشانہ بنے۔

تحقیقاتی کمیٹی ضلع حکاموں کو بھی اس فساد کے لیے ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ پہلی بات تو بھورے کی لاش کو ہسپتال سے پولیس اور حکاموں کی موجودگی میں چھین جھپٹ کر لیجانا ہی بڑے شرم کی بات ہے اور پھر اس پر طرّہ یہ کہ لاش کو سیدھے شمشان گھاٹ کی طرف لیجانے کی بجائے چوراہا عبدالکریم اور اپر کوٹ جو بالکل دوسری سمت میں ہیں لیجایا گیا اور پولیس کے افسر تماشہ دیکھتے رہے۔ جلوس میں شامل لوگ "خون کا بدلہ خون" اور "ایک کے بدلے دس" جیسے اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے۔ آگے چل کر لاش کو سڑک پر رکھ دیا گیا اور جلوس میں شامل لوگوں نے مسلمانوں کی دوکانیں لوٹنا شروع کردیں۔ کچھ مسلمانوں پر تو ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں ہی حملہ بول دیا گیا تھا جب کہ پولیس افسر وہاں موجود تھے۔

تحقیقاتی کمیٹی نے پی۔اے۔سی۔ کے رول کی خاص طور پر مذمت کی ہے۔ پہلی بات تو پی۔ اے۔سی نے بے تحاشا گولیاں چلائیں اُن لوگوں پر جو اشتعال انگیزی میں قطعاً شریک نہیں تھے۔ کمیٹی کو اپنی چھان بین سے اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ جان بوجھ کر مسلمانوں کے گھروں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ کمیٹی نے مانک چوک علاقے میں کئی مسلمانوں کے گھروں پر گولیوں کے نشان دیکھے۔ ۲۱ اکتوبر کو بھی (فساد کے ۱۶ دن بعد) جب عوامی انجمن برائے جمہوریت کے یہ نمائندے اپنی چھان بین میں مصروف تھے، پی۔اے۔سی کے جوانوں کو اونچی عمارتوں پر مسلمانوں کے گھروں کی طرف بندوق تانے ہوئے دیکھا۔ جناب اقبال انصاری (جو علی گڈھ یونیورسٹی) میں انگریزی کے استاد ہیں) نے ان نمایندوں کو بتایا کہ ۵ اکتوبر کو پی۔ اے۔سی کے جوانوں نے ایک ہندو سے مسلمانوں کے مکانات بتانے کے لیے اصرار کیا تاکہ وہ اُنہیں کسی اچھی جگہ سے گولیوں کا نشانہ بنا سکیں۔ کانگریس (آئی) کے کمار دیویندر پال سنگھ نے کمیٹی کو بتایا۔ اس بات کی تصدیق اور معتبر ذرائع سے بھی ہوئی ۔ کہ بنی اسرائیل کا علاقہ چوراہا عبدالکریم سے تقریباً آدھا کیلومیٹر ہے اور یہاں مسلمانوں کی آبادی ہے۔ اس علاقے میں ہندو فرقہ پرست نہیں پہنچے تھے۔ اور ۵ اکتوبر کو یہاں کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود بندوق کی نُبلی کے رسیا پی۔ اے۔سی کے نوجوان یہاں پہنچے اور مسلمانوں پر فائرنگ کی۔ اس میں دو آدمی مارے گئے شمیم، عبداللہ گرلز کالج کا کلرک اور روزگار کی تلاش میں میرٹھ سے آیا ہوا ایک مہمان۔ ٹیم کی تحقیقات کے

مطابق ایک تیسرا آدمی بھی گولی کا نشانہ بن گیا۔ لوگوں کا عام طور پر یہ کہنا تھا کہ پی۔ اے۔ سی میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور کمیٹی کے ممبروں کو اپنی چھان بین کے دوران پی۔ اے۔ سی میں ایک مسلمان نہیں ملا۔

صرف مانک چوک کے علاقے میں ۱۲ آدمی مارے گئے (سرکاری ذرائع کے مطابق مرنے والوں کی کل تعداد ۱۲ ہے)۔ ٹیم کے افراد پہلے وارڈ نمبر ۱۲ میں مکان نمبر ۴۔ ۵۰ میں گئے۔ اس گھر میں دو مسلمان مارے گئے ہیں۔ لیاقت عمر ۲۵ سال اور مختار عمر ۲۴ سال۔ یہ دونوں پھل بیچنے والے تھے۔ اُنہیں وہ لمبا بھالا دکھایا گیا جس سے اُن دونوں کے جسم کو چھید اگیا تھا اور جو حملہ آوروں میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اُس گھر کی عورتیں جن کی موجودگی میں یہ دونوں قتل کیے گئے اس وقت تک مبہوت تھیں پولیس میں حملہ آوروں کے نام کے ساتھ شکایت درج کرائی گئی لیکن ابھی تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی ہے۔ اس کے پاس والے مکان نمبر ۲۰۵ میں اس گھر کی عورت سروری بیگم نے بتایا کہ اس گھر کے ایک آدمی کو بھالا بھونک کر دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ اور ان ٹکڑوں کو جلتی آگ میں پھینک دیا گیا۔ سروری بیگم نے یہ بھی بتایا کہ آر۔ ایس۔ ایس کے کچھ لوگوں نے دو ہفتے قبل مسلمانوں سے اپنے مکان خالی کرانے کی کوشش کی تھی اور بھیانک انجام کی دھمکی بھی دی تھی۔ سروری بیگم نے حج کے لیے دو ہزار روپیہ بچا کر رکھا تھا وہ بھی لوٹ لیا گیا۔ یہاں بھی حملہ آوروں کی شناخت کے باوجود پولیس نے کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس کے بعد تحقیقاتی ٹیم اسی وارڈ میں مکان نمبر ۵۴۲ میں گئی۔ یہاں تین آدمی مارے گئے تھے۔ سلیمان ولد عبدالرحمان، عارف اور ایک رکشے والا کسی اور علاقے کا رہنے والا تھا اور سواریوں کی تلاش میں آیا تھا۔ رکشے والے کی موت سب سے بھیانک تھی۔ اسے پہلے پھندا ڈال کر لٹکایا گیا اور پھر چاقو سے اس کے جسم کو چیرا گیا۔ پھر اُسے اتار کر ہاتھ گاڑی سے باندھا گیا اور جلا دیا گیا۔ یہ سب کچھ کئی خوفزدہ افراد کی موجودگی میں ہوا۔ ٹیم کے افراد نے جلی ہوئی گاڑی اور جلی ہوئی ہڈیاں دیکھیں۔ مانک چوک میں مسلمانوں کے سارے مکان خاموش المیہ داستان ہیں۔ یہاں فساد کرفیو نافذ ہونے کے ۵ گھنٹے بعد شروع ہوا اور آدھی رات تک لوٹ مار اور قتل زنی کے واقعات (کرفیو کے درمیان!) ہوتے رہے۔

کمیٹی کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مانک چوک کے علاقے میں فساد کا

بھورے کی لاش اور اس کے جلوس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حملہ پہلے سے تیار کی گئی منصوبہ بند سازش کا نتیجہ تھا جس کا مقصد رہے سہے مسلمانوں کو اس ہندو علاقے سے بھگانا تھا۔ مسلمانوں کے آس پاس ہندو مکانات اُس دن باقاعدہ اسلحہ خانہ بنے ہوئے تھے جہاں سے ہندو مسلمان پڑوسیوں پر پتھروں، پٹرول بموں اور دوسری چیزوں سے حملہ کر رہے تھے۔

عدالتی جانچ کے متعلق کمیٹی کو پروفیسر عرفان حبیب نے بتایا کہ اس پر کسی کو اعتماد نہیں ہے۔ ایسی جانچ کے باوجود مجرموں کو کوئی سزا نہیں ملتی۔ ۱۹۷۱ء کے فساد تین دن تک ہوتے رہے۔ اس کی عدالتی تحقیقات بالکل ناکام رہی۔ کسی پر مقدمہ تک نہیں چلایا گیا۔ ماتھر کمیشن نے ۴ سال کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی جو حکومت نے آج تک شائع نہیں کی نہ ہی اس کی سفارشات پر دھیان دیا گیا۔ پروفیسر حبیب نے یہ بھی کہا کہ پچھلے ۳۰ سالوں میں ۶ بار فساد ہوا مگر آج تک اس میں حصہ لینے والے ایک فرد کو بھی سزا نہیں دی گئی۔

کمیٹی نے اپنی اس تحقیقاتی رپورٹ میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے کہ باوجود اتنے زبردست اشتعال کے اور باوجود یونیورسٹی کے ایک کلرک کی موت کے کیمپس میں امن برقرار رکھا گیا۔ حالانکہ ماضی میں اس پر مسلم فرقہ پرستوں کا اڈہ ہونے کا بار بار الزام لگایا جا چکا ہے۔

نومبر ۱۹۷۸ء

فیروز آباد فسادات کی تحقیقاتی رپورٹ

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل کے خلاف تحریک نے جن فرقہ وارانہ فسادات کی صورت اختیار کی ان کی کہانی رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانی ہے۔ ان فسادات کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے۔ اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی فیروز آباد، فرقہ واریت مخالف کمیٹی کی طرف سے بھیجی گئی تھی۔

اس تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ ہماری آنکھیں کھول دیتی ہے۔ فیروز آباد کے فسادات میں پی۔ اے سی (صوبائی مسلح پولیس) کا رول، اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق شہر میں نظم ونسق قایم کرنے کا نہیں بلکہ فسادات کو بھڑکانے والا ثابت ہوتا ہے۔ اس کمیٹی کی تحقیقات سے مندرجہ ذیل سوال پیدا ہوئے ہیں جن پر عوام اور سرکاری عہدیداروں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے۔

(۱) پی۔ اے سی (صوبائی مسلح پولیس) نے فیروز آباد کے مقامی لوگوں کی مہمان نوازی کیوں قبول کی۔؟

(۲) کیا پی۔ اے۔ سی پر مقامی لوگوں کی اس مہمان نوازی کا اثر پڑا۔؟

(۳) ذمے دار سرکاری عہدے دار کس طرح مستعدی سے مسجد سے ٹرانسمیٹر برآمد ہونے کی افواہوں پر یقین کر لیتے ہیں۔؟

ان سوالوں پر غور کرنا اور تحقیقات کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہر فساد میں ایسی افواہیں بڑے منظم طور پر پھیلائی جاتی ہیں۔ اور ہر فساد زدہ علاقے میں مسلح پولیس کا رول اس سے کچھ بہت مختلف نہیں ہوتا۔

فیروز آباد ایک چھوٹی صنعتوں والا شہر ہے۔ یہاں چوڑیاں بنانے کے کئی کارخانے ہیں جن کے مالک زیادہ تر ہندو ہیں۔ ان کارخانوں میں تقریباً پچاس ہزار مسلمان مزدور کام کرتے ہیں۔ جو ایک علیٰحدہ بستی میں رہتے ہیں۔ فیروز آباد کی مسلم آبادی، کل آبادی کی ۴۰ فی صد ہے۔

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل کے خلاف ہڑتال کرانے کے لیے تقریباً ۲۵۰ اردو اور ۱۵۰ ہندی پوسٹر سارے شہر میں چسپاں کیے گیے۔ ۱۵ر جون کی رات سے ہڑتال شروع ہوئی اور کئی چوڑیوں کے کارخانے بند ہو گئے۔ پوسٹروں میں ہندو اور مسلمانوں سے پُرامن مظاہرے اور ہڑتال کی پرزور اپیل کی گئی تھی۔ جبکہ گلاس انڈسٹریل سنڈیکیٹ نے، جو وہاں کے صنعت کاروں کی تنظیم ہے، اس ہڑتال کی سخت لفظوں میں مذمت کی اور اسے فرقہ وارانہ کوشش کہا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ۱۵ر جون کی رات کو فیروز آباد کی آر ایس ایس کی مقامی چاروں شاکھاؤں کی میٹنگ بلائی گئی اور سوئم سیوکوں کو ہدایت دی گئی کہ اگر ذرا بھی کوئی ایسی بات ہو تو مسلمانوں کو اچھا سبق سکھایا جائے۔

فساد کے ڈر سے شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی تھی۔ ۱۶ر جون کو نماز جمعہ کے لیے تقریباً ڈھائی تین ہزار مسلمان جامع مسجد میں اکٹھا ہو گئے۔ دو بجے نماز ختم ہونے پر لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اپنے اپنے گھر یا دوکانوں پر لوٹنے لگے۔ نمازیوں کی بھیڑ ہندو مارکیٹ سے بھی پُرامن طریقے سے گذر گئی۔ حالانکہ جوشیلے نوجوان نعرے لگا رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ پھر بھی آدھے گھنٹے کے اندر گولیاں برسنے لگیں۔

پولیس نے گولی کیوں چلائی؟ جتنے منہ اتنی باتیں۔ رمیش سنہا، ۱۶ر جولائی کے 'نیو ایج' میں لکھتے ہیں کہ فیروز آباد میں آر۔ ایس۔ ایس اور جماعت اسلامی جیسی فرقہ پرست جماعتوں کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپسی تناؤ نہیں ہے اور تجارتی تعلقات کی بنا پر آپس میں میل ملاپ رہتا ہے۔ دوپہر کو گولی چلنے سے پہلے شہر میں مکمل امن تھا۔ صرف چند جوشیلے مسلمان نوجوان جن کی تعداد ساٹھ سے زیادہ نہیں تھی ادھر اُدھر نعرے لگا رہے تھے۔ لیکن دونوں طرف کے عوام کسی قسم کی شرارت میں قطعی شامل نہیں تھے۔ اس لیے اگر پولیس اور حکام ہوشمندی سے کام لیتے تو حالات پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا تھا۔

مگر صوبائی مسلح پولیس نے مظاہرین کو خبردار کیے بغیر اور آنسو گیس چھوڑے بغیر لاٹھیوں

سے پیٹنا شروع کر دیا۔ فیروز آباد میں جن سنگھ کے لیڈر کو چھوڑ کر سب کی یہی رائے تھی کہ مسلح پولیس نے حد سے زیادہ طاقت کا استعمال کیا اور سینکڑوں لوگ بُری طرح زخمی کر دیئے گئے کئی لوگوں کے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے۔ مجمع نے پولیس پر پتھر پھینکنا شروع کیے جس سے چند پولیس کے آدمی زخمی ہوئے مگر کوئی اسپتال میں داخل نہیں کیا گیا۔ اسی اثنار میں پوربی پولیس چوکی کے ہیڈ کانسٹبل نے گولی چلا کر ایک اویس نام کے آدمی کو مار ڈالا۔ اس پر ۴۰۔۵۰ نوجوانوں کا گروہ پوربی پولیس چوکی کی طرف بڑھا، جہاں ہیڈ کانسٹبل نے پناہ لے رکھی تھی۔ مجمع نے پولیس چوکی کے فرنیچر اور جو کچھ ہاتھ لگا اُسے اکٹھا کر کے پولیس چوکی کے سامنے آگ لگا دی۔

صوبائی مسلح پولیس نے اب بے دھڑک فائرنگ شروع کر دی۔ ایک درجن سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ جو جان بچا کر بھاگنے لگے، انھیں پیچھا کر کے زخمی کیا گیا۔ کچھ مارے جانے والوں کے نام یہ ہیں :۔ شمس الدین، جاوید، اویس، منا خاں، عین الہدیٰ اور مصطفےٰ۔ اسی دوران میں ایک مسلمان کی لکڑی کی دوکان میں آگ لگائی گئی جو بھڑک کر سارے علاقے میں پھیل گئی اور ایک چوڑیوں کا کارخانہ بھی اس کی نذر ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد ۷۸ گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا۔ ان ۷۸ گھنٹوں میں جو کچھ ہوا وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات ہیں جن کی ذمہ داری تمام تر مبینہ طور پر صوبائی مسلح پولیس پر عائد ہوتی ہے۔ جن سنگھ کے لیڈر کو چھوڑ کر سب کی یہ متفقہ رائے تھی کہ مسلح پولیس اور مقامی پولیس نے مل کر ایسے ظلم ڈھائے جو بیان سے باہر ہیں۔ ان کی بربریت نے تقریباً ۱۶ آدمیوں کی جان لی، جو ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کے سب مسلمان تھے اور انھوں نے ۲۰۔۱۵ لاکھ روپئے کی مالیت کی ملکیتوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔

اسی اثنار میں اسلامیہ کالج کی عمارت کو تین بار آگ لگائی گئی۔ پولیس نے اس کالج کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس اسلامیہ کالج میں ۶۰ فی صد طلبا ہندو ہیں۔ جامع مسجد کو بھی نذر آتش کر دیا گیا اور مسجد کے بوڑھے فالج زدہ امام کو بھی ساتھ ساتھ زندہ جلا دیا گیا۔ مسجد کے اس امام کی ہندو اور مسلمان بڑی عزت کرتے تھے۔

جب ایک مصیبت زدہ آدمی اپنی ملکیت جلائے جانے کی شکایت درج کرانے

پولیس اسٹیشن گیا تو حکام نے اُسے گولی چلانے کے الزام میں گرفتار کرلیا۔

مسلح پولیس نے کئی مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر آدمیوں، عورتوں اور بچوں کو مارا پیٹا اگر کسی نے احتجاج کیا تو گندی گالیاں بکیں اور ہاتھ پیر توڑ ڈالے۔ تحقیقات کے دوران لوگ سچ سچ بتانے سے گھبراتے تھے کہ کہیں ہتھیار بند پولیس پھر سے بدلہ نہ لے۔

فیروز آباد میونسپلٹی کے چیرمین کے گلاس فیکٹری کے مزدوروں کو خود انھیں کی نگرانی میں پولیس نے بے حد مارا پیٹا۔ یہی آدمی جب امن کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے ان مزدوروں کے لیے سامان لے کر آیا تو مزدوروں نے امداد لینے سے صاف انکار کردیا۔ پولیس نے گرفتار شدہ لوگوں سے ساتھ اتنا بے رحمانہ سلوک کیا کہ عید محمد، جو کھچڑا بیچا کرتا تھا، مار پیٹ اور پیاس کی تاب نہ لاکر حوالات ہی میں مر گیا۔

پولیس اور ہتھیار بند پولیس کے برتاؤ کی وجہ سے کئی لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ کھیر کھو کھل کی ایک عورت کے شوہر اور بھائی کو ہتھیار بند پولیس نے گولی مار کر ھلاک کر ڈالا اور اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ایک ہندو کو مارا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ہندو کو پولیس ہی نے غلطی سے مار ڈالا تھا۔ یہ عورت زخمی ہو کر اپنے بچے کو لے کر بھاگ رہی تھی لیکن چند غنڈوں نے اس پر چاقو سے وار کر کے مار ڈالا۔ یہ عورت دم توڑنے سے پہلے کئی گھنٹوں تک تڑپتی رہی مگر پولیس نے کسی کو بھی مدد کے لیے پاس جانے نہیں دیا۔

ایک دوسرا گھناؤنا واقعہ ایک آدمی کا ہے جسے ہسپتال سے مرہم پٹی کرا کے پولیس گھر لے جا رہی تھی جب یہ ایک ہندو محلے کے پاس پہنچے تو پولیس نے اسے اکیلے ہی آگے بڑھنے کے لیے کہا اُس آدمی نے پولیس سے گلی کے پار لے جانے کی گڑگڑا کر التجا کی مگر اُسے اکیلے دھکیل دیا گیا۔ جب وہ اکیلا بڑھا تو پولیس نے مقامی غنڈوں کو مارنے کے لیے اُکسایا اور آخر کار اُسے لاٹھیوں سے حملہ کر کے مار ڈالا گیا۔

فساد کے کئی دن بعد بھی یہ ہتھیار بند پولیس کئی بے گناہوں سے جھوٹے وارنٹ بتا کر پیسہ وصول کر رہی ہے۔ زیادہ تر گرفتار شدہ لوگ بے گناہ ہیں اور اصلی فسادی اب بھی کھلے بندوں لوٹ مار کر رہے ہیں۔ عجیب اور صحت مند بات یہ ہے کہ مسلمان علاقوں میں ہندوؤں کی

جان و مال کی پوری حفاظت کی گئی۔ مثال کے طور پر تیلیوں والی گلی میں ہندو صرافوں اور روپیہ اُدھار دینے والوں کی کئی دکانیں ہیں لیکن ان میں سے کسی کو نقصان نہیں پہونچایا گیا۔ ایک بنیا اپنے نوکر اور لڑکی کو چھوڑ کر باہر گیا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے ان دونوں کی پوری حفاظت کی حالانکہ وہاں سے قریب ہی مسلمانوں کی دو کانوں کو جلایا جا رہا تھا۔

فساد میں ہندوؤں نے خود سے کوئی حصہ نہیں لیا، انہیں زبردستی اکسایا گیا۔ پولیس اور صوبائی ہتھیار بند پولیس نے ہندو غنڈوں کی لوٹ مار کرنے میں خاص طور سے مدد کی اور انہیں اس لوٹ میں حصہ دیا۔ پولیس اور ہندو غنڈوں کی اس ساز باز کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۷، ۱۸، اور ۱۹ جون کو پی۔ اے سی اور پولیس کو کھانا کھلانے کے لیے، اٹاوالا، دوار کا جی مندر اور پرانی منڈی میں لنگر کھولے گئے۔

دوسری طرف کئی ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دی لیکن ایک ایم، ایل، اے میونسپل چیرمین اور کانگریس کے ایک عملدار پر فساد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا الزام لگایا جاتا ہے۔

ہر فساد کی طرح، افواہوں کا فیروز آباد میں جھگڑے میں بھی خاص رول تھا۔ ان افواہوں کو پولیس اور شہری حکام کی مرضی سے پھیلایا گیا۔ کرفیو کے دوران چونکہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے تھے اس لیے ان افواہوں کا اثر بڑا ہلاکت خیز ثابت ہوا۔ چونکہ تقریباً سبھی مسلمانوں کے ٹیلی فون فسادیوں نے کاٹ دیئے تھے لہذا ان افواہوں کی تصدیق ناممکن ہو گئی۔ یہ افواہ بھی پھیلائی گئی کہ راجستھانیوں کی بستی میں ہندوؤں کو زندہ جلا دیا گیا۔

ہتھیار بند پولیس کا ایک آدمی ہندو محلے میں یہ آواز لگاتے سنا گیا کہ تم لوگ کیسے آرام سے سو رہے ہو جبکہ سینکڑوں ہندو زندہ جلا دئے گئے۔ اس افواہ کا اثر لوگوں پر کیا ہوا ہوگا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مسجد میں سے ٹرانسمیٹر برآمد ہونے کی افواہ زوروں پر پھیلی ہوئی تھی دورے پر آئے ہوئے ایک ایم، پی کے سامنے پولیس کے اعلیٰ افسر نے اس افواہ کی تردید کی مگر اس کے باوجود یہ افواہ برقرار رہی۔ ایک ایس۔ ڈی۔ ایم نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مسجد میں سے ٹرانسمیٹر برآمد ہوا ہے۔ جب اس سے اور سوال پوچھے گئے تو اس نے اعتراف کیا کہ میں نے آج تک کوئی

ٹرانسمیٹر دیکھا ہی نہیں، مجھے نہیں معلوم ٹرانسمیٹر کیسا ہوتا ہے۔

کیا یو پی کی سرکار ان پولیس افسروں کے خلاف کڑی کارروائی کرے گی جن پر فیروزآباد کے فساد کی ساری ذمے داری عائد ہوتی ہے یا ہر فساد کی طرح پولیس افسر اپنی زیادتیوں کے باوجود صاف چھوٹ جائیں گے۔؟

(جون ۱۹۷۲ء)

فساد اور ونوبا کا مرن برت

ترقی پسند عناصر کے لیے لمحۂ فکریہ

ہمارا ملک پھر نازک موڑ پر کھڑا ہے۔ ایمرجنسی بظاہر اندرا گاندھی کا اقتدار بچانے کے لیے ایک قدم تھا لیکن اسے محض ایک شخصی اقتدار کا ڈرامہ قرار دینا ایک زبردست غلطی ہوگی۔ دراصل ایمرجنسی سے پہلے ملک کی معاشی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور چاروں طرف بے چینی پھیل رہی تھی۔ اس بے چینی نے جے پرکاش نرائن کی رہنمائی میں سیاسی تحریک کی صورت اختیار کی اور بہار، یوپی مہاراشٹر، گجرات وغیرہ جیسے صوبوں میں بڑی بھاری تعداد میں عوام اس تحریک میں شریک ہونے لگے۔ برسرِ اقتدار طبقہ نراجیت کے خوف سے کانپنے لگا۔ جے پی کی عوامی تحریک میں نکسل وادیوں کا ایک گروہ بھی شریک ہو گیا تھا۔ اور سرمایہ دار اور دیہی علاقوں کے دھنی کسان اس بات سے سب سے زیادہ خائف تھے۔ بظاہر اندرا گاندھی نے مغربی بنگال اور بہار میں نکسلی تحریک کو طاقت کے زور سے کچل دیا تھا مگر بگڑتی ہوئی معاشی حالت برسرِ اقتدار طبقے کو ان انقلابیوں سے ہمیشہ خائف رکھتی تھی۔ بالآخر برسرِ اقتدار طبقے کے ایک حصے نے اندرا گاندھی کی نافذ کردہ ایمرجنسی میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔

یہاں ایمرجنسی کا ذکر خاص طور سے اس لیے کرنا پڑا کہ ہم ان سیاسی اور معاشی قوتوں کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں جو مختلف سیاسی اقدامات، پالیسیوں یا مختلف جماعتوں میں گٹھ جوڑ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ تو ہم سب جانتے ہی ہیں کہ ایمرجنسی کے مظالم سے تنگ آ کر آخر ہندوستانی عوام نے چناؤ میں کانگریس سے اقتدار چھین لیا اور جنتا پارٹی کو اس ملک کی سیاسی اور معاشی باگ ڈور سپرد کر دی۔ عوام نے جنتا پارٹی کو اقتدار سپرد کر کے چین کی سانس لی اور یہ سمجھا کہ ایمرجنسی کی

لعنت ختم ہوئی اب شاید جنتا پارٹی اپنے انتخابی منشور میں کیے گئے وعدوں کو پورا کر کے معاشی بدحالی کی لعنت بھی دور کر دے۔

لیکن اسے خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ معاشیات کے طالب علم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج تیسری دنیا کے ممالک ایک طرف بین اقوامی کارپوریشنس، جسے انگریزی میں ملٹی نیشنل کارپوریشنس کہا جاتا ہے، کے استحصال کا شکار ہیں تو دوسری طرف اُن سے ساز باز کرنے والے مقامی سرمایہ داروں کی ہوس کا۔ دراصل یہ بڑے بڑے سرمایہ دار اُن ہی سیاسی جماعتوں کا ساتھ دیتے ہیں جو انھیں عوام کی معاشی لوٹ کھسوٹ کی کھلی اجازت دیں۔ پھر جنتا پارٹی میں تو سوتنترا پارٹی جیسی انتہا پسند سرمایہ دارانہ جماعت اور جن سنگھ اور بی ایل ڈی جیسی بیچ کے درجوں والے بیوپاریوں اور دھنی کسانوں کی حامی دائیں بازو کی جماعتیں شامل ہیں۔ بھلا ایسی پارٹی جس کے اراکین عوام کا استحصال کرنے والے طبقوں کے پوری طرح حامی ہوں، کس طرح محنت کش عوام کا یا نوکری پیشہ متوسط طبقہ کے لوگوں کے معاشی مسائل حل کر سکتی ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جنتا پارٹی، چند عناصر کو چھوڑ کر، بنیادی طور پر دائیں بازو کی جماعت ہے جس کا دماغ سیاسی ضروریات اور دباؤ کی وجہ سے عوام کے ساتھ ہے، لیکن دل بڑے بڑے سرمایہ داروں اور زمینداروں کے ساتھ۔ ظاہر ہے ان حالات میں جنتا پارٹی عوام کے بنیادی مسائل کو کسی حالت میں حل نہیں کر سکتی۔ ایک طرف عوام کی طرف سے ان مسائل کو جلد از جلد حل کرنے کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے تو دوسری طرف جنتا پارٹی میں اقتدار کی کشمکش اس کے مختلف گروہوں میں جاری ہے۔ معاشی بحران جتنا تیز ہوتا جا رہا ہے۔ جنتا پارٹی میں دائیں بازو کے عناصر اقتدار پر قبضہ کرنے کی اپنی سرگرمیوں کو اتنا ہی تیز کرتے جا رہے ہیں۔ اس وقت جنتا پارٹی میں سب سے زیادہ متنازعہ فیہ مسئلہ آر۔ ایس۔ ایس کا ہے۔ آر ایس ایس کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ یہ بڑی ہی منظم جماعت ہے اور نظریاتی اعتبار سے ہندو راشٹر کی قائل ہے۔ گرو گولوالکر نے اپنی کتاب (A URCH OF THOUGHTS) میں ان سب کو ہندوستان میں محض مہمان قرار دیا ہے جو ہندو کلچر اور ہندو دھرم کی فوقیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف پبلک اعلانات کے باوجود آر۔ ایس۔ ایس آج بھی گرو گولوالکر کے اسی نظریئے پر قائم ہے۔

آج کل جنتا پارٹی کے مختلف گروہوں میں زبردست اقتدار کی جنگ چھڑی ہوئی ہے یہ دلچسپ بات ہے کہ یہ جنگ معمول کے مطابق نظریاتی نقاب ڈال کر لڑی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے اقتدار کی ہوس اور سیاسی امنگوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جنتا پارٹی میں شامل سوشلسٹ اور بی۔ ایل۔ ڈی پارٹی کے ممبر آج آر ایس ایس پر زوردار حملہ کر رہے ہیں اور مدھو لیمئے اور راج نرائن نے تو اُسے ایک فاشسٹ جماعت قرار دیا ہے جس کی وجہ سے ملک کی سالمیت کو زبردست خطرہ لاحق ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق راج نارائن روزانہ ملک کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے آر ایس ایس کے خلاف زوردار مہم چلا رہے ہیں۔ آر۔ ایس۔ ایس بے شک ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ ہے کیونکہ شروع سے ہی اس کی گھٹی میں فرقہ واریت کا زہر کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے اور اس خطرے کو روکنے کے لیے تمام سیکولر جماعتوں کو متحد ہو جانا چاہیے۔ لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ کیا راج نارائن کی یہ جنگ نظریاتی جنگ ہے یا محض ذاتی یا اپنے گروہ کی اقتدار کی جنگ؟ یوپی کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر یادو نے بھی آر۔ ایس۔ ایس کی پریڈ پر اس وقت پابندی عائد کی جب چرن سنگھ نے اُن کی وزارت کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ راج نارائن نے بھی جو یادو کی طرح ہی بی۔ ایل۔ ڈی سے تعلق رکھتے ہیں، چرن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس پر اپنے حملے کی دھار اس وقت تیز کی جب جن سنگھ نے چرن سنگھ کا ساتھ چھوڑ دیا اور اقتدار کی اس لڑائی میں دہ مرار جی ڈیسائی کی حامی ہو گئی۔

جنتا پارٹی میں آج اقتدار کی اس جدوجہد کی وجہ سے آر۔ ایس۔ ایس کا مسئلہ بہت ہی اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ اسے جنتا پارٹی کے بعض لیڈر، جن کا پہلے آر۔ ایس۔ ایس یا جن سنگھ پارٹی سے تعلق رہا ہے، جیسے مرکزی وزیر اطلاعات و مواصلات شری لال کرشن اڈوانی، نانا جی دیش مکھ وغیرہ، اس مسئلے کو غیر اہم قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف جنتا پارٹی کے مستقبل کے لیے یہ مسئلہ بڑا ہی اہم ہے، بلکہ اس مسئلے سے اس ملک کا مستقبل بھی وابستہ ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس اس وقت ملک کی دائیں بازو کی سب سے منظم جماعت ہے۔ اور اس وقت حالات جو رُخ اختیار کر رہے ہیں، یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ یہ جماعت مناسب وقت آنے پر فرقہ واریت کا زہر پھیلا کر اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ تمام سیکولر نظریے کے حامی سیاسی لیڈر، آر۔ ایس۔ ایس پر حملہ کرنے کے باوجود صحیح معنی میں اس تنظیم

کے خلاف نظریاتی جنگ کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بلکہ جب بھی موقع ملتا ہے، اقتدار حاصل کرنے کے لیے اس سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

اندرا کانگریس کے لیڈر بھی اپنی بدترین موقع پرستی کا ثبوت دے چکے ہیں۔ دیوراج ارس جو کرناٹک کے وزیراعلیٰ ہیں، آج تک اپنے صوبے میں آر۔ ایس۔ ایس کو برداشت کرتے رہے۔ لیکن جب یوپی کے سابق وزیراعلیٰ یادو نے آر۔ ایس۔ ایس کی پریڈ پر پابندی عائد کی تو انہیں ہوش آیا اور اپنے صوبے میں انھوں نے اس قسم کی پابندی عائد کی۔ آر۔ ایس۔ ایس کا جتنا اثر بڑھتا جارہا ہے دائیں بازو کی طاقتیں اتنی ہی متحرک ہوتی جارہی ہیں۔ علی گڈھ اور جمشید پور کے فسادات، آچاریہ ونوبا بھاوے کا ذبیحہ گاؤ کو لے کر مرن برت رکھنا وغیرہ اس کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

جمشید پور کا فساد احمد آباد کے ۱۹۶۹ء والے فساد سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ غیر سرکاری مگر معتبر ذرائع سے جو اعداد و شمار ملے ہیں اس کے مطابق ان فسادات میں ایک ہزار سے زیادہ افراد کی جانیں تلف ہوئیں اور ہزاروں افراد کا سب کچھ لٹ گیا۔ ظاہر ہے سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان مسلمانوں ہی کا ہوا ہے۔ خود جنتا پارٹی کے ذمہ دار افراد، جن میں بہار کے سابق وزیراعلیٰ کرپوری ٹھاکر شامل ہیں، نے کھلم کھلا الزام لگایا ہے کہ جمشید پور کے فساد میں آر۔ ایس۔ ایس کا ہاتھ ہے کرپوری ٹھاکر نے تو بہار کے وزیراعلیٰ مسٹر داس سے یہ مانگ بھی کی ہے کہ جمشید پور فسادات کی تحقیقات مکمل ہو جانے تک وہ کسی آر۔ ایس۔ ایس کے ممبر کو اپنی وزارت میں شامل نہ کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ نے یوپی کا بدلہ لینے کے لیے یہ فساد کرایا ہو۔ کرپوری ٹھاکر کا تعلق بی ایل ڈی سے ہے اور فساد بھی عین اُسی موقع پر ہوا جب کرپوری ٹھاکر کو نئے سرے سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔

بہرحال وجہ کچھ بھی ہو ایک بات صاف ظاہر ہے کہ دائیں بازو کی طاقتیں آر ایس ایس کی مدد سے ملک میں فرقہ واریت کا زہر پھیلانے کی کوشش کر رہی ہیں تاکہ چاروں طرف بدنظمی پھیل جائے اور انہیں اقتدار پر قبضہ جمانے کا موقع ملے۔ آچاریہ ونوبا بھاوے کا مرن برت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ دراصل اس کے پیچھے دائیں بازو کی طاقتوں کی زبردست سازش نظر آتی ہے۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ دونوں صوبے جہاں کچھ پابندیوں کے ساتھ ذبیحہ گاؤ کی اجازت ہے اور

جس کو لے کر ونوبا بھاوے نے مرن برت رکھا ہے کمیونسٹ حکومتوں کی تحویل میں ہیں ملک گیر پیمانے پر دیکھا جائے تو ذبیحہ گاؤ کا مسئلہ بالکل غیراہم مسئلہ ہے اور آئینی اور اخلاقی رو سے دیکھا جائے تو ایک فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لاکھوں لوگوں کو ان کی اپنی پسندیدہ غذا سے اس طرح زبردستی محروم کرے۔ معاشی اعتبار سے بھی یہ مسئلہ ملک کے لیے نقصان کا باعث ہے۔ اگر ۱۴ سال سے زیادہ عمر کی گایوں کو ذبح کرنے پر پابندی عاید کردی گئی تو ان کے لیے غذا مہیا کرنا مشکل ہو جائے گا یا کھیتی باڑی کی زمین پر زیادہ گھانس اگانی پڑے گی جس سے کئی انسان اناج سے محروم ہو سکتے ہیں۔ اس عمر میں یہ گائیں دودھ بھی نہیں دے سکتیں اس لیے ویسے بھی ملکی معیشت پر بار ہو جاتی ہیں۔

یہ سب تو عقلی دلائل ہیں مگر دائیں بازو کی طاقتوں کے لیے عقلی دلائل کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے وہ تو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کسی بھی جذباتی اور مذہبی مسئلے کو اچھال سکتے ہیں۔ یہ بات بھی محض اتفاقیہ نہیں ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے اخبار ونوبا بھاوے کے مرن برت کے مسئلے کو خوب اچھال رہے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ فرقہ وارانہ جذبات کو اُبھارا جا سکے۔ ونوبا بھاوے اپنے آپ کو ہر طرح کی فرقہ واریت سے برتر قرار دیتے ہیں۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ آج رجعت پرست طاقتوں کا آلہ کار بن کر ملک کے حالات خراب کرنا چاہتے ہیں ونوبا بھاوے نے آج تک اقلیتوں کے مسائل کو ہمدردی سے نہیں سمجھا۔ محض ہر مقدس کتاب سے دعائیہ کلمات پڑھ لینے کا نام سیکولرزم نہیں ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ونوبا بھاوے کا سیکولرزم اس سے بھی گیا گذرا ثابت ہو رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے مرن برت کے خطرناک نتائج کو سمجھتے ہوئے بھی ایسا کرنے پر تُلے ہوئے تھے تاکہ ملک میں اس جذباتی مسئلہ کو اچھال کر رجعت پرست اور دقیانوسی طاقتوں کے ہاتھ مضبوط کیے جا سکیں۔ ہم نے مانا کہ ونوبا بھاوے کے لیے ذبیحہ گاؤ پر پابندی مذہبی عقیدے کا مسئلہ ہے لیکن کیا ہریجنوں پر آئے دن ہونے والے مظالم اور فرقہ وارانہ فسادات میں اضافہ، اقلیتوں کا قتلِ عام انسانی مسائل نہیں ہیں؟ ان کی ہمدردی میں مرن برت یا محدود برت تو ایک طرف ونوبا بھاوے نے کبھی لفظی ہمدردی کا اظہار بھی نہیں کیا۔

مذہبی آزادی کا قانون بھی ایک غیراہم مسئلے کو اچھالنے کی سازش ہے۔ اور اسی سلسلے کی

ایک کڑی ہے۔ اس کے پیچھے جانی بوجھی سازش ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ بائیں بازو کی طاقتیں متحد نہیں ہیں۔ اور نہ ہی وہ عوام کے بنیادی مسائل کی جدو جہد کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہیں فرقہ پرستوں کی ایسی ناپاک سازشوں کا جواب نو عوامی تحریک سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ بائیں بازو کی طاقتوں کو اور کون سے دن کا انتظار ہے؟

(مئی ۱۹۷۹)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اقتدار کی جنگ؟

یوں تو آج ہندوستان کی ہر یونیورسٹی بدعنوانیوں کا شکار ہے اور تعلیم کے یہ مراکز اور درسگاہیں سیاسی سازباز اور اساتذہ اور طلباء کے مختلف گروہوں کے درمیان اقتدار کی جنگ کے اڈّے بن کر رہ گئی ہیں۔ اگر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں بھی یہی ہو رہا ہے تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن علی گڈھ یونیورسٹی کا مقابلہ اور یونیورسٹیوں سے یوں نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا اپنا ایک مقام ہے اور ہندوستان میں اس یونیورسٹی کا مسئلہ مسلم سیاست کا ایک اٹوٹ حصّہ بن کر رہ گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مسلم اقلیت اس دانشگاہ کو نہ صرف اپنا مخصوص ادارہ سمجھتی ہے بلکہ اسے اپنے تشخص اور تہذیبی شناخت کا ایک اہم جزو بھی قرار دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ سارے ملک کی توجہ کا مرکز بنی رہتی ہے اور قومی پریس بھی اس کے معاملات میں خاصی دلچسپی لیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کے تہذیبی تشخص اور اقلیتی شناخت کے اعتبار سے اس قدر اہمیت کی حامل ہے تو مسلم لیڈروں، دانشوروں اور مفکروں اور یہاں تعلیم دینے والے اساتذہ اور تعلیم حاصل کرنے والے طلباء نے اس کو مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کا مرکز بنانے کے لیے اب تک کیا کیا ہے؟ جواب تعجب خیز نہیں لیکن افسوسناک ضرور ہے۔ جہاں تک مسلم لیڈرشپ کا تعلق ہے، یہ بات بلا خوف تردید

کہی جا سکتی ہے کہ مسلم لیڈروں نے۔ چاہے اُن کا کسی بھی سیاسی جماعت سے یا نظریئے سے تعلق ہو۔ اس یونیورسٹی کے تشخص اور اقلیتی کردار کے مسئلے کو اپنے ذاتی اور سیاسی مفادات حاصل کرنے کے لیے خوب اُچھالا ہے۔ اس یونیورسٹی کے افسوس ناک حالات پر آج تک ان لیڈروں نے کوئی توجہ نہیں دی لیکن ہر چناؤ کے موقع پر اپنی سیاسی سودے بازیوں کے لیے اُسے خوب بڑھ چڑھ کر استعمال کیا۔ مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی جذبات سے اس سے زیادہ کھلواڑ کیا کیا جا سکتا ہے؟

یونیورسٹی سے باہر جو مسلم دانشور اور مفکر ہیں وہ اس مسئلے پر چپ سادھے بیٹھے رہتے ہیں انھوں نے کبھی مسلم لیڈر شپ کی موقع پرستی کو بے نقاب نہیں کیا نہ ہی یونیورسٹی کی حالت زار کو بہتر بنانے کے لیے قومی پیمانے پر کوئی مہم چلائی نہ ہی سنجیدہ بحث و مباحثے کے ذریعے صحیح رائے عامہ پیدا کرنے کی ہی کوئی منظم کوشش کی۔ نجی گفتگو میں ذاتی رائے کا اظہار کرنا ایک بات ہے لیکن اس قومی ادارے کی فلاح و بہبود کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک منظم کوشش کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ لیکن افسوس کی بات تو یہ کہ مسلم دانشوروں اور مفکروں نے نہ صرف علی گڑھ یونیورسٹی کے معاملات پر بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے دوسرے اتنے ہی اہم معاملات پر بھی خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ چند موقع پرست مسلم لیڈر اپنے چہروں پر "ملّتِ مسلمہ" کا حسین نقاب ڈالے ہوئے مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے اتنی آسانی سے کھلواڑ کر رہے ہیں۔

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبار کا حال ہی نہ پوچھیے۔ ہمارے تحقیقاتی مشن نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے احاطے میں جو کچھ دیکھا اور سنا بڑا دردناک ہے۔ "ملّت" اور مسلمانوں کی "کلچرل شناخت" کے پیچھے یہاں اقتدار کی جنگ چھڑی ہوئی ہے اور ایسے جذباتی نعرے بلند کر کے طلبار کے مستقبل سے کھیلا جا رہا ہے۔ اُس دانشگاہ کے اساتذہ آج تین مختلف گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ کی سربراہی پروفیسر رحمان علی کر رہے ہیں اور طلبار کی عرفان حبیب کے خلاف مہم کو اسی گروہ کی حمایت حاصل ہے۔ یہ گروہ ملّت اقلیتی کردار، مسلمانوں کا مذہبی تشخص جیسے شدید جذبات کے حامل الفاظ اور اصطلاحیں

اپنے پروپیگنڈہ میں استعمال کرتا ہے۔ دوسرا گروہ جس کی سربراہی مشہور مورخ پروفیسر عرفان حبیب کرتے ہیں، پہلے گروہ کے جذباتی حملوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ پروفیسر عرفان بائیں بازو کے سیاسی نظریئے اور سیکیولرزم کے حامی ہیں۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو ایڈمنسٹریشن (انتظامیہ) جس کے سربراہ وائس چانسلر سید حامد صاحب ہیں، کی حمایت کرتا ہے اور پہلے گروہ کے مقابلے میں دوسرے گروہ سے قریب تر ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان گروہوں میں آخر اس قدر تناؤ کیوں ہے؟ رحمان علی گروہ کا کہنا ہے کہ وہ عرفان حبیب کے خلاف اس لیے ہیں کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے مخالف ہیں اور اس لیے وہ یونیورسٹی دشمن عناصر میں شامل ہیں۔ ایسے یونیورسٹی دشمن عناصر کو ہم یونیورسٹی کے کھلم کھلا تنقید کی اجازت نہیں دے سکتے دوسرے یہ کہ عرفان حبیب صاحب نے اپنے اثر ورسوخ استعمال کر کے تمام اہم عہدوں پر اپنے حامی اساتذہ کا تقرر کرا رکھا ہے اور یہ کہ وہ تیسرے اور چوتھے درجے کے یونیورسٹی ملازموں کی یونینوں پر قبضہ کر کے یونیورسٹی انتظامیہ کو اپنے دباؤ میں لاتے رہتے ہیں اور بار بار ہڑتال کرواتے ہیں۔ رحمان علی صاحب نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ عرفان حبیب پچھلے تین سالوں میں ۱۰۶ ہڑتالیں کرا چکے ہیں۔

پروفیسر عرفان حبیب ان دعوؤں کی تردید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سراسر غلط ہے اور بے بنیاد بات ہے کہ وہ یونیورسٹی کے مخالف عناصر میں شامل ہیں۔ وہ تو اقلیتی کردار کے مخالف بھی نہیں ہیں۔ وہ مخالف اس بات کے ہیں کہ اقلیتی کردار کے نام پر کچھ دقیانوسی عناصر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ اس کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے اس بل کا مسودہ دکھایا جو اس وقت علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کو اقلیتی کردار عطا کئے جانے کے سلسلے میں پارلیامنٹ کے سامنے ہے۔ اس بل کے مطابق یونیورسٹی چلانے، وقتاً فوقتاً قوانین بنانے وغیرہ کے سارے اختیارات اکزیکٹیو کونسل سے لیکر یونیورسٹی کورٹ کو دیدیئے جائیں گے اور یونیورسٹی کورٹ میں تقریباً ۷۰ نشستیں دقیانوسی قسم کے عناصر کے ہاتھ میں رہیں گی۔ اس قسم کے عناصر، پروفیسر عرفان حبیب کا کہنا ہے، کسی طرح بھی ایک جدید دانشگاہ کو چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے علی گڈھ یونیورسٹی کو اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کا جدید اور مثالی مرکز بننا ہے

تو اسے چلانے کے لیے بھی جدید اور ترقی پسند ذہنوں کی ضرورت ہے۔ اس ادارے کا قیام ہی مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم عام کرنے کے لیے عمل میں آیا ہے۔ علماء وغیرہ کو مذہبی ادارے چلانے کا پورا اختیار ہے انہیں مسلمانوں کے جدید قسم کے تعلیمی اداروں میں مداخلت کا حق دیکر ان اداروں کو تباہی کی دعوت دینے کے برابر ہے۔ پروفیسر حبیب کا کہنا ہے کہ اگر اقلیتی کردار سے مراد علی گڈھ یونیورسٹی کو ہندوستانی مسلمانوں کی اعلیٰ اور جدید تعلیم کا مرکز بنانا ہے تو وہ اس کے حق میں ہیں۔

عرفان حبیب نے اس بات کی بھی سخت تردید کی کہ انہوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے یونیورسٹی کے اہم عہدوں پر اپنے حامیوں کو فائز کر رکھا ہے۔ یونیورسٹی کے ملازموں کی یونین کے بھی وہ کئی سال سے صدر نہیں رہے اور پچھلے ۱۲ سالوں میں کل ملاکر ۱۰ یا ۱۲ ٹرتالیس ہوئی ہیں۔ اور قانوناً کسی بھی پروفیسر کو ملازموں کی یونین سے وابستہ ہونے کا پورا اختیار ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ پروفیسر عرفان حبیب کی باتوں کو دوسرے ذرائع سے بھی تقویت ملتی ہے۔ پروفیسر جمال خواجہ نے جو فلسفے کے شعبے سے وابستہ ہیں ہم سے کہا کہ عرفان حبیب بے حد ایماندار آدمی ہیں اور کسی بھی قسم کی بدعنوانی کو قطعاً برداشت نہیں کرتے۔ اسی لیے کئی لوگ جن کے مفادات کرپشن سے وابستہ ہیں ان سے نالاں رہتے ہیں اور ان کو یونیورسٹی سے نکالنے کے درپے ہیں۔ پروفیسر جمال خواجہ نے عرفان حبیب کے اس بیان سے بھی پورا اتفاق ظاہر کیا جو انہوں نے ۱۳ جنوری کو انڈین ایکسپریس کو دیا تھا اور جس کے بعد یونیورسٹی میں ہنگاموں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اسی طرح شعبۂ انگریزی کے استاد پروفیسر مسعود حسن صاحب نے بھی عرفان حبیب کے مذکورہ بیان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ یہ بیان انہوں نے غلط وقت پر دیا۔ اگر یہ بیان اس وقت نہ دیا جاتا تو بہتر تھا۔ عرفان کے دشمنوں کو ہنگامہ برپا کرنے کا اتنی آسانی سے موقع نہ ملتا۔ مسعود صاحب نے بھی عرفان کے کردار کی اور ایمانداری کی تعریف کی۔ اور اس بات کی سخت تردید کی کہ عرفان نے اساتذہ وغیرہ کے تقرر میں کسی قسم کی دھاندلی کی ہے۔

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ آج عرفان حبیب کے جس بیان کو لیکر ہنگامہ برپا کیا گیا ہے تقریباً وہی بات طلباء کی یونین کے صدر عرفان اللہ اپنے ایک مضمون میں کہہ چکے ہیں جو خبر و خبر میں چھپا

تھا۔ اور ایم۔ اے۔ یو، اسٹاف ایسوسی ایشن کی طرف سے ۲۴ ستمبر ۱۹۷۹ء کو ایک میمورنڈم راشٹرپتی کو پیش کیا گیا تھا۔ اس میں بھی یونیورسٹی کی بدعنوانیوں پر زور دیا گیا ہے اور راشٹرپتی سے یونیورسٹی کے معاملات میں مداخلت کی درخواست کی گئی ہے۔ پروفیسر رحمان علی کا گروپ بھی اس میمورنڈم کا جو اے۔ آر خان، سکریٹری، اے۔ ایم۔ یو اسٹاف ایسوسی ایشن کی طرف سے صدر ہند کو پیش کیا گیا تھا، حامی تھا۔ پروفیسر رحمان علی صاحب نے خود ہمارے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ عرفان حبیب نے جو باتیں کہی ہیں ان میں سے اکثر صحیح ہیں لیکن ہم انھیں یونیورسٹی کے متعلق ایسا کوئی بیان دینے کا حق نہیں دینا چاہتے کیونکہ وہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے خلاف ہیں۔

دوسرے یہ کہ حبیب صاحب نے ان باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبار فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ پروفیسر عرفان حبیب نے اس آخری بات کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ میرے اخباری بیان کا اس الزام سے کوئی واسطہ نہیں ہے، اس سے پہلے میرے متعلق ایک اخباری مضمون میں مضمون نگار نے خود یہ بات اپنی طرف سے کہی تھی۔

طلبار میں بھی کچھ عناصر ایسے پائے جاتے ہیں جو کہ کرپشن سے ذاتی فائدہ اٹھانے میں پیش پیش ہیں اور اساتذہ نے جو ناطرفدار ہیں بتایا کہ ایسے طلبار یونیورسٹی میں ہنگامہ برپا کرانے میں پیش پیش ہیں۔ اور طلبار کے لیڈروں کی مالی امداد بھی کرتے ہیں۔ ان کا مقصد کسی طرح وائس چانسلر اور عرفان حبیب جیسے ایماندار لوگوں کو یونیورسٹی سے نکال باہر کرنا ہے تاکہ کرپشن سے انہیں ہر طرح کا فائدہ حاصل ہوتا رہے۔ طلبار کے لیڈروں نے عرفان حبیب کے خلاف جیسے پمفلٹ شائع کیے ان کی سطح بھی بہت گری ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک پمفلٹ میں جو تاج پرنٹنگ ورکس نئی بستی علی گڑھ سے طلبار کے لیڈروں کے دستخط کے ساتھ شائع ہوا ہے، کہا گیا ہے:

(عرفان حبیب نے) شعبۂ تاریخ میں اپنے "ہٹلری دور" میں علمی کارناموں کو پس پشت ڈال کر گروہ بندی، سازشوں اور دھوکہ دہی کی روایات کو فروغ دیا۔ چند اوباش قسم کی مستورات کا تقرر کر کے ان کے ذریعہ نوجوان لڑکوں کو گمراہ کر کے اپنے گروہ کو تقویت پہنچانے کی بدعت کی شروعات کا سہرا ان "راجہ اندر" کے ہی سر ہے۔

اس پمفلٹ کی زبان سے ہی اس کے معیار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بعض اور پمفلٹ میں اس سے

بھی زیادہ گراوٹ کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بعض طلبا کو عرفان حبیب سے کس قدر ذاتی بغض و عناد ہے۔ پروفیسر عرفان حبیب نے کچھ طلبا کو امتحان میں بدعنوانی کرتے ہوئے پکڑا تھا یہ بات سب کو معلوم ہے۔ خود وائس چانسلر سید حامد صاحب نے بھی اس بات کی گواہی دی کہ عرفان اپنی ایمانداری میں مصلحت کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔

سید حامد صاحب کا جب وائس چانسلر کے عہدے پر تقرر ہوا تو ان کا یہ کہہ کر استقبال کیا گیا تھا کہ یہ ملت کے آدمی ہیں لیکن آج پروفیسر رحمان علی صاحب کا گروہ اور طلبا کے ایجی ٹیشن کے لیڈر ایک ہی بات پر مُصر ہیں کہ یونیورسٹی میں امن بحال کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ حامد صاحب مستعفی ہو جائیں۔ پروفیسر رحمان علی صاحب کے گروہ کا یہ کہنا ہے کہ طلبا وائس چانسلر سے سخت ناراض ہیں۔ جب سے یونیورسٹی میں پولیس نے گولی بار کیا (یہ واقعہ ۱۳ مئی ۱۹۸۱ء کا ہے) اور ایک طالبعلم کی جان گئی' سب کا اعتماد ان پر سے ہٹ گیا ہے' اساتذہ کا بھی اور طلبا کا بھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس واقعے سے اساتذہ اور طلبا میں بدگمانی پیدا ہوئی لیکن یہ پوری حقیقت نہیں ہے۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اکثر اساتذہ وائس چانسلر کے مستعفی ہو جانے کے حق میں ہے۔ انتظامیہ کے حامی گروہ کو چھوڑ کر بھی اکثر اساتذہ وائس چانسلر کے مخالف نظر نہیں آتے۔

کئی غیر جانبدار اساتذہ نے ہمیں بتایا کہ دراصل حامد صاحب ایک بہت ہی ایماندار ایڈمنسٹریٹر ہیں اور انہوں نے یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالتے ہی کرپشن کے خلاف کارروائی شروع کر دی جس سے کئی اساتذہ اور طلباء کے مفادات کو سخت نقصان پہنچا۔ دراصل وائس چانسلر کے خلاف ایجی ٹیشن میں اکثر ایسے ہی عناصر شامل ہیں جن کے مفادات کو یا تو چوٹ پہنچی ہے یا پہنچنے کا ڈر ہے۔ بعض اساتذہ کو بعض سنگین قسم کے الزامات لگا کر معطل کیا گیا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ الزامات کہاں تک درست ہیں کیونکہ ابھی ان کی تحقیقات ہونا باقی ہے لیکن معطل شدہ اساتذہ اس گروہ میں شامل ہیں جو وائس چانسلر کے مستعفی ہو جانے کی مانگ کر رہا ہے۔

سید حامد صاحب نے بعض تادیبی کارروائیوں کی مثال دیتے ہوئے ہمیں بتایا کہ اکثر شعبوں میں اساتذہ طویل مدت کی تعطیل پر مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں ملازمت کے لیے چلے گئے ہیں۔ اس سے

یونیورسٹی کی صلاحیت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے میں نے یہ سرکلر جاری کیا ہے کہ کسی بھی شعبے میں بیک وقت ۲۰ فیصد سے زیادہ اساتذہ طویل مدت کی چھٹی لیکر نہیں جا سکتے۔ ظاہر ہے مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں اچھی خاصی تنخواہیں ملتی ہیں اور اس سرکلر سے کئی اساتذہ کے مفادات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ کرپشن ختم کرنے کے لیے وائس چانسلر نے کئی اور کارروائیاں کی ہیں جن سے متأثرہ عناصر (جن میں طلبار بھی شامل ہیں) آج اس ایجی ٹیشن کو ہوا دے رہے ہیں۔ یہ بات بھی مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ وائس چانسلر نے بعض صحیح فیصلے غلط وقت پر کئے جس سے ان عناصر کو طلبار کو بھڑکانے میں مدد ملی۔ ایک باہوش منتظم کو صحیح حکمت عملی بھی بنانا پڑتی ہے۔

ذاتی مفادات کی اپنی منطق ہوتی ہے اور یہ منطق بڑی بے رحم ہوتی ہے۔ یہ منطق ہر نظریئے پر، ہر مذہب پر اور ہر نیک مقصد پر اسی کا سہارا لیکر حاوی ہو جاتی ہے۔ آج علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں بھی انہی ذاتی مفادات کی جنگ نظر آتی ہے جو "ملّت" اور اقلیتی کردار" کے نام پر لڑی جا رہی ہے۔ دراصل ان حسین اصطلاحوں کو اپنے مفادات پر پردہ ڈالنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبار امن چاہتے ہیں لیکن چند مفاد پرست یونیورسٹی کا امن غارت کر کے طلبار کے مستقبل کو بھی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں یہ جنگ نظریاتی ہرگز نہیں ہے یہ مفادات کی جنگ ہے۔ اقتدار کی جنگ۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف اسی لیے صف آرار ہے کہ دوسرے گروہ کو ہر طرح سے انتظامیہ سے بے دخل کر کے سارا اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ جو بھی ان کے راستے میں آتا ہے وہ "ملّت" اور مسلمانوں کا دشمن قرار پاتا ہے۔ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم عام کرنے کا خواب جو سر سید نے دیکھا تھا ابھی تک شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔

جولائی ۱۹۸۱ء

نوٹ:۔ آج یونیورسٹی کورٹ میں جس طرح اقتدار کے لیے رسّہ کشی ہو رہی ہے اس سے مندرجہ بالا مضمون میں کی گئی پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوتی نظر آرہی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بل
کیا یہ ہنگامہ حق بجانب ہے؟

پارلیمنٹ نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل پاس کیا۔ اس بل نے مسلمانوں کے دلوں میں کئی جا اور بے جا شکوک پیدا کر دیئے ہیں۔ چند مسلم تنظیموں نے، جن کا فرقہ وارانہ کردار ظاہر ہے، ملک گیر تحریک چلانے کی ٹھان لی ہے، اور اس بل کی مخالفت میں ایک زبردست ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ کیا یہ ہنگامہ حق بجانب ہے؟ اس کے لیے بل کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے۔ اور بل کے ان پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے لیے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا مختصر جائزہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت سب پر واضح ہے کہ مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی پس ماندگی ختم کرنے کے لیے سرسید نے علی گڈھ محمڈن کالج کی بنیاد ڈالی۔ سرسید جب اس قابلِ تحسین کام کا بیڑہ اٹھائے ہوئے تھے تو اس کے خلاف ایک مسلمان طبقہ نے زبردست ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ دیوبند کے علماء اور بڑے بڑے بااثر جاگیردار اور نواب اس منصوبے کی سخت مخالفت پر آمادہ تھے ان کا غم و غصّہ اس بات سے اور بھڑکا ہوا تھا کہ سرسید مذہب کو عقل کی روشنی میں سمجھنا چاہتے تھے، اور سائنس و مذہب میں وہ بنیادی تضاد کے قائل نہیں تھے۔ تنگ نظر علماء اور رجعت پرست جاگیردار مسلمانوں کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم تھا۔ اس جرم کو مزید پھیلنے سے بچانے کے لیے وہ انگریزی تعلیم کی ہی سرے سے مخالفت کر رہے تھے۔ لیکن زمانہ جیسے جیسے گذرتا گیا مغربی علوم اور انگریزی تعلیم کی اہمیت اور سرسید کے موقف کی سچائی ان پر واضح ہوتی گئی۔ زمانے کے حالات سے مجبور ہو کر ان لوگوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی سرسید کا ساتھ دینا پڑا۔

مگر ان لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے سرسید کو کچھ قیمت ادا کرنی پڑی۔ مسلمانوں کے اس جاگیردار طبقے نے یہ شرط لگادی کہ سرسید مذہب کا عقلی جائزہ لینا ترک کردیں اور روایتی مذہب کی تعلیم کو اس انگریزی کالج میں لازمی قرار دیا جائے۔ مجبوراً سرسید کو یہ بات ماننا پڑی۔ اور مسلم تھیالوجی کی شکل میں روایتی مذہب کی تعلیم آج بھی موجود ہے۔ مسلمانوں کے ان مفاد پرست عناصر کی مخالفت رنگ لائی۔ اور رجعت پرستوں کی پکڑ کالج کے انتظامیہ پر بڑی مضبوط ہوگئی اور خاص طور سے یہ اس لیے ہوا کہ کالج کو ان کے عطیات کی بڑی ضرورت ہوتی تھی۔

سرسید تحقیق اور عقل کی بنیاد پر اسلامک اسٹیڈیز کی جو ہمت افزائی کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس رجعت پرست طبقے کے چھا جانے کی وجہ سے نہ کر سکے۔ دراصل سرسید کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہ سکا اور جاگیردارانہ عناصر کے سائے میں دور وسطیٰ کے روایتی مذاہب کے رائج کرنے کو اقلیتی کردار کا نام دے دیا گیا۔

جوں جوں مغربی تعلیم ملک میں پھیلتی گئی۔ علی گڈھ کالج کی اہمیت بھی بڑھتی گئی اور مسلمان لیڈروں نے اس کالج کو یونیورسٹی کی شکل دینے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے ذریعے علی گڈھ محمڈن کالج کو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل کردیا گیا۔ یہ بات یہاں اچھی طرح ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ یہ ایکٹ وائسرائے کی کونسل نے پاس کیا تھا۔ اور اس کونسل میں جاگیردار اور رجعت پرست مسلمانوں کا بڑا اثر تھا۔ انگریز اپنے مفاد کی خاطر ایسے عناصر کی خاص طور سے پشت پناہی کرتا تھا۔

اسی لیے اس ایکٹ کے تحت یونیورسٹی کورٹ میں اس طبقے کو خاص طور سے نمائندگی دی گئی مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کو، جو اس طبقے کی نمائندگی کرتی تھی، چالیس نمائندے مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا۔ شاید اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ آزادی سے پہلے مسلم لیگ کا اثر اس ادارے پر بہت نمایاں تھا۔ مسلم لیگ نے اپنی سیاست کے لیے یہاں کے طلبار کو خوب استعمال کیا۔ جامعہ ملیہ دہلی قوم پرست مسلمانوں کا گڈھ بنا اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی فرقہ پرست مسلمانوں کا۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں زیادہ تر اعلیٰ طبقے کے مسلمان تعلیم پاتے تھے اور جامعہ ملیہ میں نچلے طبقے کے مسلمان۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل جو حال ہی میں پارلیمنٹ نے منظور کیا ہے، ایک حد تک

قابلِ تعریف قدم ہے۔ اس بل کے ذریعہ گورنمنٹ نے یونیورسٹی کورٹ کی رکنیت میں بنیادی تبدیلیاں کی ہیں، اس ایکٹ کی رو سے مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کو، جو مفاد پرست اونچے طبقے کی مسلمانوں کی تنظیم ہے اور اب برائے نام ہی وجود رکھتی ہے، یونیورسٹی کورٹ میں نمائندگی سے قطعاً محروم کر دیا گیا ہے۔ اس کی جگہ اب ۲۵ نمائندے ہندوستان کا صدر نامزد کرے گا۔ اور ۱۵ نمائندے یونیورسٹی کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔ باقی نمائندے یونیورسٹی کے طلباء اور پروفیسرس مقررہ تناسب سے منتخب کریں گے۔ اس طرح سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہلی یونیورسٹی ہوئی جو طلباء کو اس کے نظم و نسق میں اتنا بڑا حصّہ دے گی۔ جمہوری اقتدار کا یہ بنیادی تقاضا ہے کہ طلبا کو بھی تعلیمی ادارے چلانے میں شامل کیا جائے، دراصل طلباء کی تحریک ہر جگہ یہ مانگ منوانے پر زور دے رہی ہے۔ اور ہر یونیورسٹی کو اسی طرح طلباء کی نمائندگی میں حصہ دینا چاہیئے۔ صدر کے نامزد کیے ہوئے ۲۵ نمائندوں میں علمی، سماجی اور صنعتی اداروں کے معزز اراکین شامل ہوں گے۔ مفاد پرست اور رجعت پرست اراکین کے بجائے جمہوری طور سے نمائندگی کرنے والے طلباء، اساتذہ اور اپنے پیشے کے ممتاز اراکین کی رکنیت ہر صورت میں بہتر سمجھی جانی چاہیئے۔ یہ تبدیلی یونیورسٹی کو ایک نئی زندگی اور نئی سمت دے گی۔ انیس ممبروں پر مشتمل ایکزیکیٹو کونسل میں بھی یونیورسٹی کے اساتذہ کو بڑی بھاری نمائندگی دی گئی ہے۔

بل کی مخالفت کون کر رہا ہے؟ جن مسلم جماعتوں نے اس کی مخالفت میں حصہ لیا ہے وہ ہیں مسلم مجلس، مسلم لیگ، مجلس مشاورت، جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت۔ یونیورسٹی کورٹ کی ساخت میں تبدیلی کرنے سے انہیں لوگوں کے مفاد کو ضرب پڑتی ہے۔ چونکہ ان کی نمائندگی چھن گئی ہے اس لیے یہ ہنگامہ برپا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی دوکان چمکانے کے لیے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی دُہائی دے رہے ہیں۔ یہ اقلیتی کردار کیا ہے؟ یہ وہ خود بھی نہیں سمجھا سکتے۔ اگر اُن کی یونیورسٹی کورٹ میں نمائندگی باقی رہے تو اقلیتی کردار بھی بنا رہتا ہے ورنہ نہیں۔ مسلم لیگ نے اونچے طبقے کے مسلمانوں کا مفاد بچانے کے لیے پاکستان بنایا اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے مسلم کلچر کا نعرہ لگایا ——————— یہ مسلم کلچر کیا تھا؟ جاگیردار طبقے کے مسلمانوں کا کلچر۔ کیا ایک مزدور اور پسماندہ طبقے کے مسلمان کا کلچر وہی ہے جو اعلیٰ طبقے کے مسلمان کا ہوتا ہے؟

پھر یہ مسلم کلچر کی بات کیسی؟ کچھ ایسی ہی گڑبڑ والی بات اقلیتی کردار کی ہے۔ اگر اقلیتی کردار نام ہے رجعت پرست روایت پرست اور علیحدگی پسند مسلمانوں کا یونیورسٹی کے کاروبار پر چھائے رہنے کا، تو یہ جتنی جلد ختم ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ لیکن اگر اقلیتی کردار سے مراد صحیح معنی میں اسلامک اسٹڈیز اور ہمارے مشترک کلچر کی شاندار روایتوں کی علمی تحقیق اور ہمت افزائی ہے تو یہ باقی رہے گا اور ترمیمی بل اس کردار میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا ہے۔

۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں اغراض و مقاصد کا جو تمہیدی حصہ ہے، اس میں یہ ترمیمی بل کوئی تبدیلی نہیں تجویز کرتا اور اسی لیے لفظ "مسلم" نہیں ہٹایا گیا۔ یہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے جائز اقلیتی کردار کی بھرپور ضمانت ہے۔ دوسرے یہ کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے رہائشی کردار کو بھی برقرار رکھا گیا ہے علی گڈھ شہر کے دو کالجوں کا اس سے الحاق نہیں ہوگا۔ جن سنگھ نے لفظ "مسلم" نکلوانے کے لیے اور رہائشی کردار ختم کرانے کے لیے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ دونوں طرف سے فرقہ پرست اس معاملہ کو ہوا دے رہے ہیں۔ اور اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں ہمیں اس بل کی اچھائیوں کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، وہاں چند جائز شبہات کو، جو کسی بھی انصاف پسند، غیر جانبدار انسان کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں، دبانا بھی نہیں چاہیے۔ حکومت نے اس بل کو پاس کرانے کے لیے اس قدر غیر ضروری جلد بازی سے کیوں کام لیا؟ حکومت کو اقلیتی فرقے کے احساسات کو جائز طور پر پورا وزن دینا چاہیئے تھا۔ اگر اس بل کو سلیکٹ کمیٹی کے حوالے کر دیا جاتا تو مسلم عوام کو اپنے جائز شبہات دور کرنے اور بل میں ضروری ترمیمیں پیش کرنے کا موقع مل جاتا۔ حکومت کو بھی مختلف ذریعوں سے اپنی نیک نیتی کی یقین دہانی کرنی ضروری تھی۔

اور کیا یہی تبدیلیاں بنارس ہندو یونیورسٹی میں بھی کی جائیں گی؟ کیا سرکار نے اس سلسلے میں کوئی بل بھی تیار کیا ہے؟ حکومت کو چاہیے کہ وہ ان جائز شبہات کو رفع کرے ورنہ فرقہ پرست عناصر مسلم عوام کو اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

جن سنگھ جو کٹر ہندو فرقہ پرست جماعت ہے، اس مسئلے کو اپنے طور سے اچھال رہی ہے علی گڈھ شہر کے دو کالجوں کو وہ مسلم یونیورسٹی سے ملحق کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ یونیورسٹی میں اس کے حامی طلبا کی اکثریت ہو جائے۔ اور اسے یونیورسٹی کے معاملات میں عمل دخل حاصل ہو سکے۔

دراصل جن سنگھ جب تک خاموش تھی مسلم مجلس کے پہلے مظاہرے میں بہت کم مسلمان شریک ہوئے تھے پہلا مظاہرہ تقریباً ناکام ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن جب جن سنگھ نے دو شہر کے کالجوں کے الحاق اور لفظ مسلم ہٹا دینے کی تحریک شروع کی تو بڑی تعداد میں مسلمان بل کے خلاف مظاہروں میں شریک ہو گئے۔ چنانچہ یکم جون والے دوسرے مظاہرے میں بڑی بھاری تعداد میں مسلمان شامل ہوئے۔ درحقیقت جن سنگھ کے اس جارحانہ رجحان نے فرقہ واریت کی فضا کو اور بھی مسموم بنا دیا ہے اس واقفیت کی روشنی میں حکومت کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اقلیت کے شبہات کو دور کرنے کے لیے اس کا اعتماد حاصل کرلے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ تعلیمی نظام اور سماجی ڈھانچے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ترمیمی بل نہایت ضروری قدم ہے۔ مسلم عوام کو اگر اس کے فوائد ہمدردانہ طریقے سے سمجھائے گئے تو وہ اُسے ضرور قبول کریں گے۔ اور مسلم مجلس، مسلم لیگ اور جماعت اسلامی جیسے فرقہ پرست عناصر خود بخود بے نقاب ہو جائیں گے۔ یہ لوگ دراصل انہیں لوگوں کے وارث ہیں، جنہوں نے ابتدا میں علی گڈھ مسلم کالج بنانے کی مخالفت کی تھی اور آج انھیں رجعت پرست مسلمانوں کے لائق وارث رجعت پرستانہ اقلیتی کردار کو قائم رکھنے کے لیے ترمیمی بل کی مخالفت کر رہے ہیں۔ دراصل ہر تبدیلی اور ترقی پسند قدم، مسلم عوام پر ان کی گرفت کو ڈھیلی کر دیتا ہے۔

(جولائی ۱۹۷۲ء)

بہار شریف فرقہ وارانہ فساد
ایک تجزیہ

ذات پات اور فرقہ وارانہ فسادات، ایسا لگتا ہے، ہماری قومی زندگی کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ کہیں ہریجنوں کے خلاف تشدد کی خبریں ملتی ہیں تو کہیں سے مذہبی اقلیت کے خلاف فساد کی۔ مراٹھواڑہ کے بعد مراد آباد اور مراد آباد کے بعد گجرات اور گجرات کے بعد بہار شریف کیا روز بروز ذات پات اور مذہبی بنیادوں پر تعصبات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے؟ یہ عجیب بات نہیں معلوم ہوتی کہ ایک طرف ہندوستان صنعتی، علمی اور سائنسی میدانوں میں ترقی کر رہا ہے اور دوسری طرف تنگ نظری اور تعصبات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے؟ عام طور پر تو یہ کہا جاتا ہے کہ سائنس، ٹکنالوجی اور علم کی ترقی اور پھیلاؤ کے ساتھ ان تعصبات میں کمی ہوتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ روز بروز فرقہ وارانہ تشدد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

دراصل اگر اس مسئلے کو ہمیں صحیح تناظر میں سمجھنا ہو تو ہمیں اس کا گہرائی سے تجزیہ کرنا ہوگا اور مختلف عوامل مدِ نظر رکھنا ہوں گے۔ عام طور پر ہم اسے محض ذات پات یا ہندو مسلم مسئلہ بنا کر اسے مذہبی یا ذات پات پر مبنی تعصبات کی حدود میں محدود کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تعصبات آج بھی بڑے طاقتور ہیں اور ان فسادات میں ان کا بھی بنیادی رول ہوتا ہے مگر یہ سمجھنا کہ اس کے علاوہ دوسرے عوامل محض ثانوی اہمیت رکھتے ہیں، صحیح نہیں ہوگا۔ سیاسی اور معاشی عوامل کی اہمیت کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ہم سنجیدگی اور گہرائی سے واقعات کا تجزیہ کریں تو جدید سماجی علوم کی روشنی میں یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ ان فسادات میں سیاسی اور معاشی عوامل کا بڑا اہم رول ہوتا ہے اور دراصل یہی مفادات، مذہبی اور ذات پات پر مبنی تعصبات کو ایک طاقت ور ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کا ہی حال دیکھ لیجئے۔ یہ ممالک تو سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں بلکہ صنعتی دور کے بھی ماورا نکل چکے ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ وہاں سے بھی نسلی فسادات کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ اور جب عام طور پر یوروپ یا امریکہ معاشی بحران کا شکار ہوتے ہیں (یعنی صنعتی پیداوار کا کم ہونا، بے روزگاری میں اضافہ ہونا، ڈالر یا پاؤنڈ پر بین الاقوامی وجوہات سے دباؤ آنا وغیرہ۔) نسلی تعصب اور نتیجے کے طور پر تشدد میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اور ایشیائی اور افریقی ممالک سے گئے ہوئے لوگ وہاں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگتے ہیں۔

ہندوستان میں ذات پات یا مذہبی تعصب کا مسئلہ بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے مذہبی تعصبات اپنی جگہ پر ہیں، انہیں مٹانا کم ازکم مستقبل قریب میں تو بڑا مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن یہ تعصبات عام آدمی کے تحت الشعور میں روپوش رہتے ہیں اور ان کے باوجود وہ اپنی روزمرہ کی زندگی کے فرائض پُرامن طریقے سے انجام دیتا رہتا ہے۔ لیکن کہیں کوئی سازش ہوتی ہے اور منظم طریقہ سے خون خرابہ شروع ہو جاتا ہے۔ کیا یہ مار دھاڑ، یہ قتل و غارت گری محض مذہب کی خاطر کی جاتی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو ۳۶۵ دنوں میں ہم ۳۶۰ دن آپس میں گھل مل کر نہ رہتے، کیونکہ ان پانچ دنوں میں ہی نہیں باقی ماندہ ۳۶۰ دنوں میں بھی ہم ہندو اور مسلمان ہی ہوتے ہیں، برہمن اور ہریجن ہی ہوتے ہیں۔ آخر ان پانچ دنوں میں ہمیں کون سی طاقتیں لڑا دیتی ہیں؟ اگر ہر فساد کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کیا جائے تو ان طاقتوں کی نشاندہی کرنا مشکل کام نہیں ہے۔ آئیے ہم بہار شریف کے فسادات کو ہی لے لیں۔

بہار شریف بہت قدیم شہر ہے اور مسلمان اور ہندوؤں دونوں کے لیے یہاں مقدس مذہبی مقامات ہیں۔ اس وقت بہار شریف کی آبادی تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار ہے اور اس میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً ۴۰ فیصد ہے۔ مسلمانوں کا آبادی میں اتنا زیادہ تناسب

بہت کم شہروں میں پایا جاتا ہے۔ مہاراشٹر میں بھیونڈی اس کی ایک اور مثال ہے۔ بھیونڈی ہی کی طرح بہار شریف میں بھی مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد مزدور پیشہ ہے۔ یہاں بیڑی کے کئی کارخانے ہیں اور تقریباً ۲۰ ہزار کے قریب بیڑی مزدور ہیں۔ کچھ لوگ بنکر کا بھی کام کرتے ہیں لیکن ان کی تعداد بیڑی مزدوروں کے مقابلے میں کم ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں سی۔پی۔آئی کا اثر زیادہ ہے۔ سی۔پی۔آئی کی اپنی ٹریڈ یونین ہے جس میں کئی ہزار بیڑی مزدور شامل ہیں۔ اِس وقت بہار قانون ساز اسمبلی کا ممبر بھی اور پارلیامنٹ کا ممبر بھی کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کا مسلمان مزدور عام طور پر سی۔پی۔آئی کو ووٹ دیتا ہے۔ بہار شریف میونسپلٹی میں اس وقت ۳۰ ممبروں میں سے ۱۴ ممبر کمیونسٹ پارٹی کے ہیں اور ان ممبوں میں تقریباً ۶۰ فیصد مسلمان ہیں۔ ہر سال میونسپلٹی کا چیئرمین یا ڈپٹی چیئرمین دونوں میں سے ایک مسلمان ہوتا ہے۔

ظاہر ہے یہ بات ہندو فرقہ پرستوں کو بہت کھٹکتی ہے اور وہ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ مسلمانوں کا خصوصاً اور بائیں بازو کی جماعت کا عموماً اثر کم کیا جائے اور ہندؤں اور مسلمانوں میں فرقہ پرستی کا شعور پیدا کر دیا جائے تاکہ ان دونوں فرقوں کے غریب متحد نہ ہو سکیں یہی وجہ ہے کہ بہار شریف میں آر۔ایس۔ایس بڑی سرگرم عمل ہے اور اس کی کئی شاخیں یہاں قائم ہو چکی ہیں۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ آر۔ایس۔ایس کے پیرو کار زیادہ تر تیلی اور سونی دو ذاتوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ دونوں ذاتیں تجارت پیشہ ہیں۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ چھوٹے تاجر زیادہ دقیانوسی اور فرقہ پرست ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پورے ہندی علاقے میں آر۔ایس۔ایس کی جڑیں انہی چھوٹے تاجر پیشہ طبقوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آر۔ایس۔ایس کے لیڈر اس کا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان تاجروں سے مالی امداد بھی حاصل کرتے ہیں چنانچہ مصدقہ ذرائع سے میں نے اپنے بہار شریف کے دورے کے درمیان معلوم کیا کہ اس فساد کے لیے بھی اسلحہ حاصل کرنے اور دوسری تیاریوں کے لیے آر۔ایس۔ایس نے انہی تاجروں سے مالی امداد لی تھی۔ راج کشور جو آر۔ایس۔ایس کا سرسنگھ چالک ہے اور جس نے اِن فسادات میں کلیدی رول ادا کیا ہے' (فساد کے شکار کئی مجروح اور لٹے ہوئے لوگوں نے

بہار شریف میں خود مجھ سے کہا کہ راج کشور ذاتی طور پر لوٹ مار کرنے والے غنڈوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اور ایک مقتول عورت نے تو اپنے نزاعی بیان میں اس کا نام دیا ہے) خود ایک تاجر پیشہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ فساد کرا کر آر ایس ایس نے بڑی حد تک اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست خلیج پیدا ہو گئی ہے' ایک غریب سے غریب مزدور اور رکشا چلانے والے یا قلی' میں بھی اپنے ہندو یا مسلمان ہونے کا شدید احساس پیدا ہو چکا ہے (میں یہاں فرقہ وارانہ احساس کی بات کر رہا ہوں' مذہبی احساس کی نہیں) اور یہی فرقہ پرست چاہتے بھی ہیں۔ اس سے ایک طرف مزدوروں کی تحریک کمزور ہو گی اور دوسری طرف سی۔ پی۔ آئی کا اثر کم ہو گا۔ بہار شریف میں یہ بات آج اچھی طرح محسوس کی جا سکتی ہے

یہ تو ہوئی اس فساد کی سیاسی وجہ۔ دوسری اہم وجہ معاشی ہے۔ بہار شریف بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ یہاں بیڑی کی صنعت کے علاوہ آس پاس کے علاقوں میں آلو کافی مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔ آلو کی یہ فصل کافی سود مند ہے اور یادو ذات کے لوگ زیادہ تر اس کی کاشت کرتے ہیں۔ آلو کی حفاظت کے لیے بہار شریف میں کئی کولڈ اسٹوریج پلانٹ بھی وجود میں آ چکے ہیں اس وقت کل ملا کر یہاں ۵۴ کولڈ اسٹوریج پلانٹ پائے جاتے ہیں۔ چاروں طرف معاشی سرگرمیوں کی وجہ سے یہاں زمینوں کی قیمت میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ زمین کے ہر خالی ٹکڑے پر لوگوں کی نظریں لگی رہتی ہیں۔ بہار شریف میں مسلمانوں کی بڑی قدیم آبادی ہے اور' جیسا کہ اوپر بتایا گیا' ان کی آبادی کا تناسب بھی یہاں بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جگہ جگہ قبرستان کی زمینیں پائی جاتی ہیں۔ قبرستان کے کئی قطعوں پر تو اب قبروں کے نشان بھی نظر نہیں آتے۔ یادو جو زیادہ تر آلو کی کاشت کرتے ہیں' ان زمینوں پر نظر جمائے بیٹھے ہیں ۳۰ اپریل کو یہاں جو فساد شروع ہوا وہ بھی قبرستان کی ایک زمین کو لیکر ہی شروع ہوا تھا گگن دیوان کے علاقے میں ایک ٹیلے پر قبرستان کی زمین کا یہ قطعہ واقع ہے جو چوپایوں کی حفاظت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یادو اس پر اپنا قبضہ جمانے کی فکر میں تھے اور ایک عرصے سے اس پر جھگڑا چل رہا تھا۔ چند مہینوں قبل کچھ یادوؤں نے راتوں رات وہاں ایک چبوترہ اور شیولنگ بنا لیا اور اُسے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے گوبر سے ڈھک دیا۔ تقریباً

ایک مہینے کے بعد مسلمانوں کی اس پر نظر پڑی اور اس انکشاف کے بعد دونوں گروہوں میں مسلح جھڑپیں ہوئیں۔ اس کے بعد مقامی ایم، ایل، اے نے ضلع حکام سے اس قضیے کو نمٹانے کی اپیل کی اور انجمن مفیدالاسلام کے چند نمائندے بھی کلکٹر سے ملے اور جلد از جلد اس کا فیصلہ کرنے پر زور دیا۔ انجمن مفیدالاسلام کے سکریٹری نے مجھے بتایا کہ بہار شریف میں ۲۲ ایسی زمینوں کے متعلق مسلمانوں اور یادوؤں کے درمیان جھگڑا چل رہا ہے۔ ۲۵۔ اپریل کو مفیدالاسلام کا ایک وفد پھر کلکٹر سے ملا اور کلکٹر نے مئی کو ملی جلی ایک میٹنگ بلا کر اس کا فیصلہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یادوؤں کا دعویٰ بالکل کمزور تھا اور وہ کسی ایسی میٹنگ کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ خبر ملتے ہی آر ایس ایس نے فسادات کی تیاری شروع کر دی اور ۳۰۔ اپریل کو تاڑی کے برتن پر جھگڑے کا فائدہ اٹھا کر منظم طریقے سے فساد شروع کر دیا۔ فساد منظم طریقے پر کرایا گیا اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ گگن دیوان کے علاقے سے بہت دور بائی پاس کے قریب پہلی موت واقع ہوئی۔ ملازمت سے فارغ ایک کانسٹبل قمر الحسن اس کا نشانہ بنا۔ ظاہر ہے مئی کو کلکٹر کے آفس میں زمین کے فیصلے کے سلسلے میں کوئی میٹنگ نہ ہو سکی فسادات میں یہ سچ ہے کہ مذہبی جنون کام کرتا ہے اور عام آدمی اس جنون کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس جنون کے پیچھے بھی ایک حسن کرشمہ ساز، ہوتا ہے جو بڑے نپے تلے طریقے سے اسے استعمال کرتا ہے۔ ماہر سماجیات کا یہی کام ہے کہ وہ اس جنون کے پیچھے جو منظم طاقتیں کام کرتی ہیں اس کا پتہ چلائے اور تمام متعلقہ عوامل کا تجزیہ کرے۔

بہار شریف کے فسادات میں ایک معاشی عامل تو یہ قبرستانوں کی زمینوں والا ہے دوسری اہم بات یہاں کے مسلمانوں کے ایک طبقے کی (حالانکہ یہ طبقہ محدود ہے) بڑھتی ہوئی خوشحالی ہے۔ یہ پچھلے کئی فسادوں میں دیکھا گیا ہے کہ جہاں اقلیت یا ہریجن کچھ ترقی کر کے خوشحالی کی منزل میں قدم رکھتے ہیں فرقہ وارانہ یا ذات پات کی بنیاد پر فساد کرا کر ان کو تباہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ گجرات ہو یا مراٹھواڑہ، مرادآباد ہو، یا علی گڑھ اور جمشید پور، ہر جگہ یہ بات دیکھنے میں آئی ہے۔ گجرات میں ہریجنوں کے خلاف حالیہ فسادات کی بھی میں نے چھان بین کی

ہے۔ وہاں بھنگیوں کو جو سب سے نیچی ذات ہی نہیں مارا گیا لیکن سب سے زیادہ تباہی ونکروں کی ہوئی۔ کیونکہ تعلیم کے اعتبار سے بھی اور مالی اعتبار سے بھی وہ خاصے خوشحال ہیں۔ مراٹھواڑہ میں بھی مہاروں پر ہی حملہ ہوا اور دوسری ہریجن ذاتوں کو ہاتھ نہیں لگایا گیا کیونکہ ان سب میں زیادہ خوشحال مہار ہی تھے جنہوں نے امبیڈکر کی کوششوں کے نتیجے میں زیادہ تعلیم حاصل کی. اور معاشی اعتبار سے نسبتاً زیادہ خوشحالی حاصل کی۔

بہار شریف میں بھی شہر کی تیزی سے ترقی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک طبقے نے بھی اس کا فائدہ اٹھایا۔ اس شہر میں مسلمانوں کے دو ہائی اسکول اور ایک کالج بھی ہے۔ کئی خاصے پڑھے لکھے اور خوشحال لوگ بھی ہیں۔ ایک مسلمان کا سینما ہاؤس بھی تھا جسے فسادیوں نے جلاکر خاک کر دیا۔ کلکتہ کے ایک بڑے تمباکو کے بیوپاری کے دو بڑے گودام جلا دیے گئے۔ جس میں' اس بیوپاری کے دعویٰ کے مطابق ۴۵ لاکھ کی مالیت کا مال تھا۔ کچھ مسلمانوں کے کولڈ اسٹورنگ پلانٹ میں شیئر بھی ہیں۔ یہ بھی ہمیں ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ یہ ٹکراؤ اکثر ان ذاتوں یا فرقوں میں ہوتا ہے جن میں یا تو سیدھا معاشی مقابلہ ہوتا ہے یا جہاں ایک خوشحال ذات دوسری آگے آنے والی ذات سے خطرہ محسوس کرے جیسا کہ گجرات میں ونکروں اور پٹیلوں کے درمیان فساد ہوا۔ بہار شریف میں بھی یادوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ رہی چونکہ یادو آلو کی کاشت سے خوشحالی کی منزلیں تیزی سے طے کر رہے ہیں اور وہ مسلمانوں سے کمزور کی حیثیت سے ان کی قبرستان کی زمینیں ہتھیا لینا چاہتے ہیں اور اُنہیں مسلمانوں کی خوشحالی میں زیادہ طاقتور ہو جانے کا خطرہ نظر آتا ہے۔ معاشی خوشحالی ظاہر ہے سیاسی قوت کی بھی شکل اختیار کرتی ہے اور خصوصاً آر ایس ایس یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ اقلیتیں سیاسی طور پر زیادہ طاقتور ہوں. اس لیے فسادات کے ذریعے سیدھا ان کی معاشی بنیادوں پر حملہ کرنے کی منظم کوشش کی جاتی ہے۔ بہرحال آج ہندوستان میں اعلیٰ ذاتیں اور اکثریتی فرقے کے خوشحال طبقے نچلی ذاتوں اور اقلیتی فرقے کے خوشحال طبقوں کی (UPWARD SOCIAL MOBILITY) یعنی سماجی ترقی کو روکنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں تاکہ ہندوستان کی معاشی ترقی کا زیادہ سے زیادہ حصہ اُنہی کو ملتا رہے۔

ہندوستان میں صنعتی ترقی کی رفتار بہت دھیمی ہے اور آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ایسی حالت میں مختلف ذاتوں، فرقوں اور طبقوں میں زیادہ سے زیادہ جدوجہد ہونا فطری بات ہے۔ ایک پچھڑے ہوئے سماج میں ذات پات اور فرقہ بندیوں کی یوں بھی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے اور جب دولت کی تقسیم میں حصے کا سوال آئے تو اس کی بنیادیں اور بھی مضبوط ہو جاتی ہیں۔ آج ہم ذات پات اور مذہب کی بنیاد پر اپنی شناخت قائم کرنے کی پہلے سے بھی زیادہ کوشش کر رہے ہیں دوسرے لفظوں میں مذہبی معنی میں ہم کم سے کم ہندو یا مسلمان ہوتے جارہے ہیں لیکن سماجی اور تہذیبی معنی میں زیادہ سے زیادہ۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس فرقہ وارانہ شناخت یا ذات پات کی بنیاد پر شناخت قائم کر کے ہم سیاسی اور معاشی فوائد حاصل کرنے کے لیے زیادہ بااثر طور پر گروہ بندی کر سکتے ہیں اس لیے آگے چلکر بھی مختلف فرقوں اور ذاتوں میں یہ تصادم اور بڑھے گا اور مجھے فرقہ وارانہ فسادات میں کمی ہوا ایسا نظر نہیں آتا۔ یہ بات افسوس ناک سہی لیکن حقیقت ہے کہ آج ترقی پذیر ملکوں میں طبقاتی شناخت پر فرقہ وارانہ شناخت غالب آتی جارہی ہے۔ اس سماجی حقیقت سے انکار کرنا بے سود ہے۔ ہر سماجی حقیقت بڑی پیچیدہ ہوتی ہے اور طبقاتی شناخت اور فرقہ وارانہ شناخت کا آپس میں گڈمڈ ہو جانا یا موخرالذکر کا اول الذکر پر غالب آنا اس پیچیدگی کو اور بڑھا وا دینا ہے۔

قومی یکجہتی بہت ضروری ہے لیکن آج ہمارا ملک جن بحرانی حالات سے گذر رہا ہے ان میں میں نہیں سمجھتا کہ لیڈروں کی اپیل سے قومی یکجہتی قائم ہو سکتی ہے نہ ہی ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعروں سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ مجھے تو صاف نظر آرہا ہے کہ یہ ذاتوں اور فرقوں کے درمیان تصادم اور تیز ہوگا اور فسادات کی تعداد اور بڑھے گی۔ ان میں کمی ایک ہی صورت میں ہو سکتی ہے اور وہ صورت ہے دولت کی منصفانہ تقسیم لیکن ہمارے حکمراں ایسا ہرگز ہونے نہیں دیں گے اور وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت طبقاتی شعور کو دبانے کے لیے فرقہ وارانہ شعور اور ذات پات کے شعور کو ہوا دیں گے۔ پس ماندہ ملک میں اگر سماجی اور معاشی مسائل حل نہیں کئے جا سکتے تو عوام میں فرقہ وارانہ شعور کے احساس کو تیز کر کے انہیں آپس میں لڑایا تو جا سکتا ہے دوسرے لفظوں میں معاشی مسئلے کو حکمراں طبقے مذہبی سطح پر لے جا کر ایک طرف ذہنی انتشار اور دوسری طرف فرقہ وارانہ فساد پیدا کر سکتے ہیں۔

مئی ۱۹۸۱ء

بہارشریف فسادات کے بعد

بہار شریف کی خونیں داستان فسادات کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ وہاں کے مقامی ذرائع سے جو خبریں مل رہی ہیں وہ کم چونکا دینے والی نہیں ہیں۔ یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فسادات کے پیچھے مفاد پرستوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عوام کا قتلِ عام کرا کر وہ اپنے سیاسی، معاشی اور اُن سے وابستہ دیگر مفادات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس سمت میں مذہبی تعصبات کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہم اس کا تجزیہ انہی کالموں میں شائع شدہ بہار شریف پر ایک مضمون میں کر چکے ہیں اور یہاں دہرانا ضروری نہیں سمجھتے۔

فساد کے ساتھ ان مفاد پرستوں کا خونیں ڈرامہ ختم نہیں ہو جاتا۔ یہاں سے ایک نئے مرحلے کی شروعات ہوتی ہے۔ ریلیف کے نام پر یا تو وہی مفاد پرست عناصر یا نئے مفادات اپنا سیاسی اور معاشی مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فسادات کے سلسلے کی گرفتاریوں میں بھی ان کا ہاتھ صاف نظر آجاتا ہے۔ دراصل گرفتاریاں اُن کی نہیں ہوتی جو فسادات اور بے گناہ عوام کے قتلِ عام کے ذمے دار ہوتے ہیں بلکہ گرفتاریاں ان کی ہوتی ہے جنہیں مقامی سیاسی مفادات اور ضلع حکمراں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ مفاد پرستوں کی ان شرمناک حرکتوں سے فساد زدہ لوگوں کے مصائب اور تکالیف میں جو اضافہ ہوتا ہے ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

ہر جگہ فساد کے بعد یہی ہوتا ہے، بہار شریف میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ تحقیقات کے دوران مجھے بتایا گیا تھا کہ ایک نوجوان جس کے گھر کے ٦ افراد فساد میں مارے گئے تھے جب

پولیس میں شکایت درج کرانے گیا تو اسے ہی گرفتار کر لیا گیا اور اس بات کی تصدیق ضلع کلکٹر نے کی تھی۔ ریلیف میں کئی قسم کے سیاسی عناصر بڑے سرگرم عمل نظر آرہے تھے اور ان میں کانگریس آئی کے لوگ خاص طور سے نمایاں تھے۔ چند ٹکڑوں کا انتظام کرکے وہ لٹے ہوئے مظلوم اور بے بس انسانوں پر یہ تاثر پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وہ ان کے لیے کتنا کام کر رہے ہیں تاکہ ضمنی چناؤ میں ان کے ووٹ حاصل ہو سکیں (بہار شریف کے فساد کے بعد ہی چند دنوں میں ضمنی چناؤ ہوئے)۔ حالانکہ فسادات اور قتل عام کی ذمّے داری کانگریس آئی حکومت پر کچھ کم نہیں تھی۔

ریلیف کے پیچھے انسانی ہمدردی کم اور سیاسی مقصد زیادہ تھا اس کا کھلا ثبوت ریلیف کیمپ کے وہ حالات ہیں جو آج بہار شریف میں پائے جاتے ہیں اور ضلع حکّام کا وہ رویّہ ہے جو فساد زدہ لوگوں کے ساتھ آج روا رکھا جا رہا ہے۔ ضمنی انتخابات ہو چکے، اب انسانیت کا ماتم کیسا؟ آج ان بے چاروں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ بہار شریف کالج کے ایک مقامی لیکچرر عظمت حسین خاں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: "یہاں ابھی بھی لوگ (ریلیف) کیمپوں میں کسمپرسی کی حالت میں ہیں۔ رمضان میں تو اور بھی تکلیف ہے۔ راشن اگر سرکار دیتی ہے تو لکڑی ندارد ہے۔ اور دوسری باتوں کی تکلیف ہے وہ الگ۔ سرکاری عملے کے لوگ انہیں (ریلیف کیمپ میں رہنے والوں کو) واپس جانے پر مجبور کرتے ہیں جبکہ انہیں معلوم ہے کہ اکثر لوگوں کے مکان تو لوٹنے کے بعد جلا دیئے یا منہدم کر دیئے گئے تھے۔ اب وہ کہاں جا کر اپنا سر چھپائیں۔ سرکار نے مکان بنانے کے لیے جو رقم دی ہے وہ بالکل ناکافی ہے اور پھر برسات میں مکان کیسے بنوایا جائے۔ اور پھر لوٹے گئے سامان کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہے۔

تباہی اور مصائب کی یہ دردناک داستان یہیں ختم نہیں ہوتی۔ جن کو مار کر جلا دیا گیا یا جن کی لاشیں اب تک دستیاب نہیں ہو سکیں ان کا معاوضہ سرکار دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

بہار شریف میں اقلیتی فرقے کے لوگوں کی جو دُرگت بنی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اپیل سے ہوتی ہے جو چند باشعور غیر مسلم دانشوروں نے اکثریتی فرقے کے افراد سے کی ہے۔

اس اپیل پر دستخط کرنے والوں میں دیوندر پرشاد سنگھ، سابق وائس چانسلر، بھاگلپور یونیورسٹی، ڈاکٹر بل بھدر پرشاد سابق وائس چانسلر پٹنہ والہ آباد یونیورسٹی، ایم کے سنہا، سابق آئی جی پولیس بہار، نول کشور سنگھ ایم۔ ایل۔ اے سابق وزیر بہار، ڈاکٹر سی، پی ٹھاکر رادھا من، سابق ایڈووکیٹ جنرل کے علاوہ اور کئی ممتاز افراد شامل ہیں۔ اس اپیل میں جو گاندھی پیس فاؤنڈیشن کی طرف سے تقسیم کی گئی ہے کہا گیا ہے۔

" بہار شریف میں پھر ایک بار ہندو مسلم فسادات ہوئے، جس کے نتیجے میں سڑک سے گذرتی بسوں سے اتار کر مسافروں کو قتل کیا گیا۔ موصولہ اطلاعات کے مطابق شہر کے ارد گرد کے ایسے تمام گاؤں میں مسلمانوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ جہاں چار پانچ سو ہندوؤں کے گھروں کے درمیان چار پانچ مسلم کنبے اپنے ہندو پڑوسیوں کی محبت اور ہمدردی کے بھروسے مدتوں سے امن و سکون کے ساتھ رہتے چلے آرہے تھے۔ قتل کے ساتھ لوٹ، آتش زنی آبروریزی اور مختلف بربریت کے ننگے ناچ کی خبر بھی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہار شریف کے دیہاتی علاقوں کے مسلمانوں کو اُجاڑ کر رکھ دیا گیا جو کسی طرح بھی ہندو بھائیوں کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں تھے بلکہ کھیتی باڑی اور ان کے دوسرے دھندوں میں ان کے مددگار اور مزدور تھے۔

" اس قتل اور تباہ کن خون ریزی نے تمام ہندوؤں کا سر شرم سے جھکا دیا ہے اور اور ہندو دھرم کو شرمندہ کیا ہے اس ملک کی آبادی کی بہت بھاری اکثریت ہونے کے سبب اقلیت کے ہر فرد کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہندوؤں کا دھرم ہے۔ ذرا ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں کیا ہم اپنا یہ فرض پورا کر رہے ہیں ؟ ہاں اس آگ اور خون کے طوفان کے درمیان ہونے والے شیطانی ناچ میں انسانیت اور انسانی قدروں کی کچھ ایسی روشن مثالیں بھی ملی ہیں جن سے یہ آس بندھتی ہے کہ ابھی انسانیت پوری طرح مری نہیں۔ جن ہندو بھائیوں نے اپنی جان اور عزت کو خطرے میں ڈال کر بے سہارا مسلمانوں کی حفاظت کی، انھوں نے ہندو دھرم اور تہذیب کا نام اونچا کیا اور ہماری لاج رکھ لی۔ ایسے ہندو بھائیوں پر ہم جتنا فخر کریں کم ہوگا۔ ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ ان کے کردار اور اخلاق کی ان تابناک

مثالوں سے سبق لیں۔۔۔اُجاڑے گئے اپنے ایک ایک مسلمان بھائی کے پاس جاکر اپنی غلطیوں کا اقرار کریں اور آئندہ کے لیے انہیں اپنی طرف سے تحفظ کی گارنٹی دیں۔۔۔۔۔"

اس دل دوز اپیل سے جہاں بہار شریف کے فسادات کی تباہ کاریوں کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اکثریتی فرقے کے ان ممتاز دانشوروں کی نیک نیتی اور خلوص کا بھی صحیح اندازہ ہوتا ہے۔اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ فساد ہندو، مسلمانوں کے خلاف یا مسلمان ہندوؤں کے خلاف نہیں کراتے بلکہ طاقتور مفادات ایک فرقے کے افراد کو دوسرے فرقے کے افراد کے خلاف بھڑکا کر پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کراتے ہیں۔مشکل یہی ہے کہ سادہ دل عوام چند مذہبی اور تاریخی وجوہات کی بنا پر فرقہ وارانہ عصبیت کے آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں اور اپنی مشترکہ جدوجہد اور آپس میں صلح و آشتی سے رہنے کی قابلِ فخر روایتوں کو بھول کر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگتے ہیں۔اس معنیٰ میں عوام کے سامنے ان مفادات کو زیادہ سے زیادہ بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے۔

ہریجن اور مسلمان آج زیادہ تر تشدد کا شکار ہو رہے ہیں۔یہ ہر اعتبار سے پچھڑے ہوئے ہیں اور سستی مزدوری مہیا کرتے ہیں بڑے بڑے سرمایہ داروں کے لیے اور دیہاتوں میں بڑے بڑے زمینداروں کے لیے۔ان میں سیاسی شعور پیدا ہونا، ان کی آگے بڑھنے کی کوشش، ان کی ترقی کرنے کے ارمان ان بڑے بڑے سرمایہ داروں اور زمینداروں کے لیے سستی مزدوری کے مواقع ختم ہو جانے کا خطرہ پیدا کرتے ہیں۔ان مفاد پرستوں کی طرف سے (کئی حالات میں خود ان فرقوں اور ذاتوں کے افراد بھی شامل ہوتے ہیں) ہمیشہ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اُن کی ہر اُس کوشش کو کچل دیا جائے جو وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے کرتے ہیں۔ہریجنوں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو عوام کو یہ بات سمجھنے کی بڑی ضرورت ہے کیوں کہ ان کا مفاد بھی ان نچلے طبقوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے نہ کہ اپنے فرقے یا اپنی ذات کے مفاد پرست عناصر کے ساتھ آج فسادات، چاہے وہ ذات پات کے نام پر ہوں، یا مذہب اور فرقہ پرستی کے نام پر، تعداد میں اسی لیے بڑھتے جا رہے ہیں کہ ان پسماندہ ذاتوں اور فرقوں کے افراد میں اپنے حقوق کا شعور بڑھتا جا رہا ہے اور ان کے سینے میں بھی ترقی کے ارمان کروٹ لینے لگے ہیں، ان کے یہ ارمان،

ان کی یہ بیداری ان مفاد پرستوں کی اجارہ داری سے ٹکرا رہی ہے جو انہوں نے ترقی کے تمام ذرائع پر قبضہ کر کے حاصل کر رکھی ہے۔ ہندو عوام بھی انہی مفاد پرستوں کی حرص و ہوس کا شکار ہیں۔ اس لیے اس جدوجہد میں ان کو بھی ہریجنوں اور مسلمانوں کا ساتھ دینا ہے تاکہ ان کے اپنے مفادات کی بھی حفاظت ہو سکے۔

بہار شریف کا فساد ہمارے ملک کا آخری فساد نہیں ہے یہ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے۔ حیدرآباد، یہاں کا خون خشک ہونے سے پہلے ہی اس لپیٹ میں آ چکا ہے۔ بہار شریف میں بھی آج چاہے قتل و غارت کا بازار گرم نہ ہو، تناؤ برابر بنا ہوا ہے۔ عوام میں آج بھی دہشت طاری ہے، بے گناہوں کی گرفتاریاں اور فسادات کے مجرموں کا آزادی سے گھومنا عوام میں اعتماد پیدا کرنے کی راہ میں سخت رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ تھوڑے بہت اصلی مجرموں کو پولیس نے اگر گرفتار بھی کیا تھا تو انہیں سیاسی دباؤ کے تحت رہا کر دیا گیا ہے۔ فسادات کے یہ مجرم پولیس میں شکایت درج کرانے والوں کو کھلم کھلا چنوتی دے رہے ہیں۔ دہشت کا یہ عالم ہے کہ اپنے گاؤں کو لوٹنے سے پہلے فسادات کا شکار افراد بندوق وغیرہ کے لائیسنس کا مطالبہ کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنی حفاظت آپ کر سکیں۔ فسادات کے دوران جن لوگوں کے پاس ہتھیار تھے وہ اپنی حفاظت کرنے میں اکثر کامیاب رہے تھے۔ فسادات کے مجرموں کو سخت سے سخت سزا دینے کے لیے اور عدالتی کارروائی جلد سے جلد اپنے انجام پر پہنچانے کے لیے مخصوص عدالتوں کا بھی مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

فساد زدگان کی طرف سے عظمت حسین خاں نے، جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ۱۱ مانگوں پر مشتمل ایک یادداشت وزیر اعظم کو پیش کی ہے۔ اس کی کئی مانگیں تو بڑی معقول ہیں جس پر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو فوری توجہ دینا چاہیئے۔ عوام کے دکھوں کی داستان بیان کرنے والی اس یادداشت کا جو حشر ہونا ہے وہ ہمیں معلوم ہے۔ یا تو وہ افسر شاہی کے جنگل میں کہیں گم ہو جائے گی یا ہر طرح کے مفادات (جن میں ضلع حکام، مقامی سیاست داں وغیرہ سبھی شامل ہیں) اس کے پرخچے اڑا کر رکھ دیں گے۔

اور فساد زدگان ایک اور ٹھنڈی آہ بھر کر نئی مصیبتیں جھیلنے کی تیاری میں مصروف ہو جائیں گے۔

جولائی ۱۹۸۱

گودھرا فرقہ وارانہ فساد
فرقہ واریت کا گھناؤنا روپ

ویسے تو گودھرا پچھلے دو مہینے سے فرقہ واریت کی مسموم فضا میں گھرا ہوا ہے لیکن گودھرا کے لیے فرقہ وارانہ تشدد کا یہ تجربہ نیا نہیں ہے۔ ۱۹۴۸ء میں بھی یہاں آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔ اور سینکڑوں بے گناہ افراد اپنی جان اور مال سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ بوہرہ محلہ تو تقریباً جلا کر خاک کر دیا گیا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ۱۹۴۸ء کے اس فرقہ وارانہ فساد میں آر۔ ایس۔ ایس نے خاصہ اہم رول ادا کیا تھا۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً یہاں چھٹ پٹ واقعات ہوتے رہے ہیں اور اکثر فرقہ وارانہ تناؤ بنا رہتا ہے۔

ہم اس مضمون میں گودھرا کے حالیہ فرقہ وارانہ فساد پر کچھ تفصیل سے روشنی ڈالیں گے جس کی ہم نے بڑی احتیاط سے چھان بین کی ہے۔ اس فساد کی نوعیت سمجھنے کے لیے ہمیں گودھرا اور وہاں کے حالات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا ہوگا کیونکہ کسی بھی فرقہ وارانہ فساد کی بنیاد محض مذہبی اختلافات یا مناقشات ہی نہیں ہوتی۔ اس کے پیچھے سیاسی، اقتصادی اور سماجی عوامل اپنی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان عوامل کو ٹھیک طریقے سے سمجھے بغیر اور ان کا صحیح تجزیہ کیے بغیر ہم کسی صحیح نتیجے پر مشکل ہی سے پہنچ سکتے ہیں۔ ایک بات ہمیں اچھی طرح یاد رکھنی چاہیئے کہ فرقہ واریت مفاد پرستوں کے ہاتھوں میں بڑا زبردست ہتھیار ہے۔ فرقہ وارانہ سیاست کا سہارا ہمیشہ ایسے مفاد پرست عناصر لیتے ہیں جو موجودہ نظام کو بنائے رکھنا

چاہتے ہیں کیونکہ اس نظام میں صحت مند اور ترقی پسند تبدیلی سے ان کے سیاسی اور معاشی مفادات کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ یہ مفادات عوام میں بڑی چالاکی اور مہارت سے تفرقہ پیدا کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے نئے نئے داؤں پیچ استعمال کرتے ہیں۔

یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ فرقہ وارانہ آگ کو بھڑکانے کے لیے ہمیشہ مذہبی تعصبات کو بڑے بھونڈے پن سے ہی استعمال کیا جاتا ہے اور یہ کہ صرف جانی پہچانی فرقہ پرست جماعتیں ہی اس آگ کو بھڑکانے کا رول ادا کرتی ہیں۔ دراصل سیاسی اور معاشی مفادات اکثر ہماری سیکیولر جماعتوں میں بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور یہ فرقہ وارانہ جماعتوں کے برخلاف، جو مذہبی تعصبات کو بھونڈے طریقے سے استعمال کرتے ہیں، سیکیولر جماعتوں میں پائے جانے والے یہ عناصر بڑی ہوشیاری اور باریکی سے فرقہ واریت کا کھیل کھیلتے ہیں۔ فرقہ وارانہ سیاست کے طالبعلموں کو ان تمام پیچیدگیوں کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے اور اس کے لیے ہر فساد کا ٹھوس۔ حالات کی روشنی میں تجزیہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ آج مشکل یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ کسی بھی فرقہ وارانہ فساد میں اُن عوامل کو نظر انداز کرکے، جو فساد پھیلانے اور اس کی جڑوں کو مضبوط بنانے میں بنیادی رول ادا کرتے ہیں، مذہبی اختلافات اور تعصبات کو ہی سرِ فہرست رکھ دیتے ہیں۔ جب تک اس غلطی کا ازالہ نہیں ہوتا، فرقہ واریت کے زہر کا تریاق تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ آئیے اب ہم ان عوامل کو حتی الامکان سامنے رکھتے ہوئے گودھرا کے فرقہ وارانہ فساد کا تجزیہ کریں اور اس اصل نوعیت کو ان تمام پیچیدگیوں کے ساتھ اُبھاریں۔

گودھرا گجرات اسٹیٹ میں پنچ محل جیسے اہم ضلع کا تجارتی مرکز ہے۔ اس شہر کی تاریخی اہمیت بھی ہے کیونکہ اس علاقے میں ہی چودھویں اور پندرھویں صدی کے دوران محمود بیگڑا نے اپنے قلعے تعمیر کیے تھے اور اپنی فوج میں کئی مقامی لوگوں کو بھرتی کیا تھا۔ اسی زمانے میں آس پاس کے کئی قبائل مسلمان ہوگئے جن کا پیشہ اس علاقے کے گھنے جنگلوں کی پیداوار کی تجارت کرنا تھا یا زراعت کے سہارے جینا۔ ان میں سے کئی محمود بیگڑا کی فوج میں بھی بھرتی ہوگئے تھے۔ یہ مسلمان گھانچی کہلاتے ہیں اور آج بھی یہ جنگلات کی پیداواروں پر یا

زراعت کے پیشے پر منحصر ہیں لیکن جو گھانچی گودھرا شہر میں آباد ہیں وہ اب چھوٹی موٹی تجارت کے علاوہ موٹر ٹرانسپورٹ پیشے کو بھی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ گھانچی مسلمان معاشی اور تعلیمی میدانوں میں بہت پچھڑے ہوئے ہیں اور ان کے متعلق یہ تاثر عام ہے کہ یہ پرانی فوجی روایتوں کے حامل لڑاکو اور مذہبی شدت اور انتہا پسندی کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کے حالات اور پچھڑے پن کو دیکھتے ہوئے اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ خوشحالی اور تحفظ کے احساس سے لبرل رجحان پیدا ہوتا ہے اور پچھڑے پن، غربت اور عدم تحفظ کی صورت میں تنگ نظری اور سماجی تناؤ۔ یہاں ہمیں یہ تاریخی حقیقت بھی مدِنظر رکھنا ہوگی کہ گودھرا کے ہندوؤں میں محمود بیگڑا کی فتوحات، اس کے فوجی حملوں اور اس دور میں ان قبائلیوں کے مسلمان ہو جانے کے خلاف سخت تعصب پایا جاتا ہے جو اکثر معاندانہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مفاد پرست عناصر اس غیر مرئی تناؤ کو اکثر اپنا ہتھیار بناتے ہیں۔

تقسیمِ وطن کے بعد حالات کچھ اور پیچیدہ صورت اختیار کر گئے۔ ویسے بھی اس دور کی فضا فرقہ واریت سے مسموم تھی اور گھانچی مسلمانوں نے عام طور پر مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ اس سے یہاں فرقہ وارانہ تناؤ کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں ایک خاصی تعداد سندھیوں کی آکر آباد ہو گئی۔ ظاہر ہے اس سے تناؤ بڑھ گیا۔ سندھی جو اپنے وطن سے بے سروسامانی کے عالم میں آئے تھے نہ صرف تجارت پر اپنا قبضہ جمانا چاہتے تھے بلکہ اُن کی نگاہیں مسلمانوں کی زمینوں اور مکانوں پر بھی لگی ہوئی تھیں۔ گودھرا میں گھانچی مسلمانوں کے علاوہ ایک خاصی تعداد بوہرہ مسلمانوں کی بھی ہے اور یہ اور مسلمانوں کے علاوہ معاشی طور پر زیادہ خوشحال ہیں۔ یہ زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں اور جنگلوں کے ٹھیکے لیتے ہیں۔ گودھرا میں ۱۹۴۸ء کے فساد کا ایک بڑا مقصد بوہرہ اور گھانچی مسلمانوں کو شہر چھوڑ دینے پر مجبور کر دینا تھا تاکہ ان کے مکانوں اور تجارت پر قبضہ کیا جا سکے اور ہوا بھی یہی پورے بوہرہ محلّے میں آگ لگا دی گئی اور گھانچی مسلمانوں کے بھی کئی مکانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ کئی خاندان یا تو پاکستان چلے گئے یا ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ظاہر ہے

ان مہاجروں کی جائداد پر سندھیوں نے اپنا قبضہ جما لیا۔ اسلام اور ہندوازم کا لیبل لگا کر تجارت اور جائداد کی لالچ اپنا کام کر رہی تھی۔

جب سے گودھرا میں سندھی آئے ہیں گھانچیوں اور ان کے درمیان ٹکراؤ کی فضا مستقل بنی ہوئی ہے۔ حالیہ فساد بھی عام ہندوؤں اور مسلمانوں میں کم اور گھانچیوں اور سندھیوں کے درمیان زیادہ شدّت سے ہو رہا ہے۔ آئے دن یہ دونوں کمیونٹیاں آپس میں لڑتی رہتی ہیں اور اگر کھلم کھلا ٹکراؤ نہ بھی ہو تو تناؤ کی زیریں لہر تو موجود ہی رہتی ہے۔ حالیہ فساد کی ابتدا بھی ایک معمولی واقعے سے ہوئی جس سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ مقامی معاشی اور سیاسی عوامل کس طرح فسادات کو ہوا دیتے ہیں۔

۲۸ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کے دن ایک سندھی اور گھانچی مسلم جو ایک دوسرے کے قریب اپنے ٹھیلے لگاتے تھے جھگڑا ہوا۔ بازار میں موجود سندھیوں اور گھانچیوں کی خاصی تعداد آناً فاناً جمع ہو گئی اور دونوں طرف سے خاصے کا معرکہ ہوا۔ اس فساد پر قابو پانے میں ضلع حکام کو خاصا وقت لگ گیا۔ اس واقعے کی تفصیل میں ہم یہاں نہیں جانا چاہتے۔ اس کے بعد ۲۹ر مارچ ۱۹۸۱ء کو پھر سندھیوں اور گھانچیوں میں سڑک کے کنارے دکان کی کیبن بنانے کے معاملے کو لیکر سخت لڑائی ہوئی۔ پولسن بازار سڑک کے کنارے کچھ لکڑے کی کیبن اور ایک پکّی دوکان تھی۔ جو ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کے فساد میں جس کا ذکر اوپر کیا گیا، جلادی گئی تھیں۔ اسی جگہ پر شہر کی میونسپلٹی نے پکّی دکانیں تعمیر کر ڈالیں اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ یہ دکانیں صرف سندھیوں کو ہی الاٹ کی جائیں گی (حالانکہ جلی ہوئی دکانوں کا مالک ایک بوہرہ مسلمان تھا)۔ میونسپل حکام نے یہ بھی فیصلہ کر ڈالا کہ جس بوہرے کی یہ کیبنیں تھیں اُنہیں دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور ان کیبنوں میں جو گھانچی کرایہ دار تھے اُنہیں وہاں سے کیبنیں ہٹانے کا نوٹس بھی دیدیا گیا۔ گھانچی مسلمانوں نے اس پر میونسپلٹی کی طرف سے بنائی دوکانوں کے خلاف سخت احتجاج کیا لیکن میونسپل کونسلروں نے اس احتجاج کو نظرانداز کر دیا۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ۲۹ر مارچ ۱۹۸۱ء فساد کی شروعات کا دن) کو گودھرا کے

ایک حلقے سے میونسپلٹی کا ضمنی چناؤ تھا۔ جہاں ووٹ دینے کے لیے بڑی تعداد میں گھانچی مسلمان جمع ہوئے تھے اور اسی دن میونسپل حکام نے ان ہی دو کانوں پر شٹر لگانے کا کام شروع کیا۔ یہ جگہ حلقۂ انتخاب سے بالکل قریب تھی اور دو کانوں پر شٹر لگاتے دیکھ کر یہ گھانچی ووٹر دوڑتے ہوئے ان دکانوں کے قریب پہنچے اور نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ جو سندھی وہاں جمع تھے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن ان کے کچھ نوجوانوں نے آس پاس سے مجمع پر پتھراؤ کیا۔ اس سے مشتعل ہو کر گھانچیوں نے نہ صرف جوابی پتھراؤ کیا بلکہ پاس ہی اسٹیشن روڈ پر جا کر (جہاں سندھیوں کی دکانیں بڑی تعداد میں ہیں) سندھیوں کی دو کانوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔

گودھرا میں سنجیدہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ضلع حکام نے (خاص طور سے کلکٹر) بوہرہ دکاندار اور گھانچی مسلمانوں کو اپنی کیبنیں بنانے کی اجازت نہ دے کر آگ پر تیل چھڑکا۔ اگر انہیں وہاں سے اپنی کیبنیں بنانے کے لیے مجبور نہ کیا جاتا تو اس طرح فساد کی آگ نہ بھڑکتی۔ اسی دوران شہر میں مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ کچھ مذہبی جنون کا شکار سندھی اسی جگہ پر (جہاں بوہرے کی دکان اور کیبنیں تھیں) سکھوں کو اپنا گوردوارہ تعمیر کرنے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔ اس افواہ سے گھانچیوں میں اشتعال اور بڑھ گیا۔ ضلع حکام نے دو کانوں کی تعمیر کے معاملے میں بھی ان کو اعتماد میں نہ لیتے ہوئے ضمنی انتخاب کے دن ہی شٹر بٹھانے شروع کر دیئے حالانکہ ویسے شٹر بٹھانے کا کام کئی دنوں سے بند پڑا ہوا تھا۔ اگر ایسا جان بوجھ کر نہ بھی کیا گیا ہو تو بھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ضلع حکام احتیاط اور دانشمندی سے کام نہیں لیتے۔ اس دن سے آج تک گودھرا میں تناؤ برابر بنا ہوا ہے اور آئے دن تشدد اور چھرے بازی کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اس دن سے شہر کے مختلف علاقوں میں کرفیو لگا رہتا ہے جس سے عام آدمی اپنی روزمرہ کی ضرورتیں بھی پوری نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے تجارت پیشہ لوگوں کے علاوہ روز محنت کر کے کھانے کمانے والوں کے لیے کرفیو کیسا وبالِ جان بنا ہوا ہے۔

طرح طرح کی افواہیں پھیلتی رہتی ہیں جس سے شہریوں پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور لوگ کوئی بھی افواہ سنتے ہی اپنا اپنا کام کاج چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ۱۸ ر جون ۱۹۸۱ء کو ایک رکشا ڈرائیور سے جھگڑا ہو جانے پر اور ۲۹ ر جون کو ایک دودھ والے اور

گھانچی کے درمیان پٹیل واڑہ علاقے میں جھگڑا ہو جانے کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پتھر بازی ہوئی اور شہر پر چند علاقوں میں دوبارہ مکمل کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ ۲۹ جولائی (عید سے چار دن قبل) کو سارے شہر میں ایک خوفناک افواہ پھیل گئی۔ کہ سندھی بدلہ لینے کے لیے عید کے دن کچھ مسلمانوں کو قتل کریں گے اور شہر میں کرفیو نافذ کرا دیں گے تاکہ عید کا تہوار نہ منایا جا سکے۔
یہ واردات عید کے دن تو نہیں ہوئی (حالانکہ لوگوں پر خوف و ہراس طاری رہا) لیکن ایک اور دو اگست کو فرقہ وارانہ تشدد نے اپنا سر اُبھارا۔ صبح ساڑھے دس بجے آٹھ ہندو اور سندھی علاقوں میں منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں پر قاتلانہ حملے ہوئے جس میں دو گھانچی موقع واردات پر ہی جاں بحق ہوئے اور ایک ۱۲ سالہ گھانچی لڑکا جو ایک سندھی کے برف کے کارخانے میں برف خریدنے گیا تھا قتل کر دیا گیا اور پاس ہی ایک مسلمان جو اپنے ٹھیلے پر نمک بیچنے نکلا تھا مار ڈالا گیا ۶ مسلمان اور شدید طور پر گھائل ہوئے۔
گھانچیوں نے بدلہ لینے کے لیے ۲ اگست کو ہائی وے سے گذرتے ہوئے ایک ٹرک کو گھیر کر حملہ کر دیا جس میں ۴ ہندو گھائل ہوئے اور ایک نوجوان بے گناہ مارا گیا۔ اُس دن سے دوبارہ چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ جو پانچ دن تک لاگو رہا۔ اس کے بعد کرفیو کے اوقات میں کچھ کمی کی جانے لگی۔ لیکن ۱۲ اگست یعنی جنم اشٹمی سے دو دن پہلے پھر یہ افواہ زوردار طریقے سے پھیلائی گئی کہ سندھی مسلمان محلے پر حملہ کریں گے جب وہ جمعہ کے دن مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہوئے ہوں گے جس طرح کہ بہار شریف میں کیا گیا تھا۔ اس دن مسلمان بڑی تعداد میں گیہا محلے میں نیلم ہوٹل کے سامنے جمع ہوئے (یہ ہوٹل دیپک نامی ایک سندھی کا ہے) تاکہ ممکنہ حملے سے اپنا دفاع کر سکیں۔ یہ سُن کر وہاں سندھیوں کی بھی بھیڑ لگ گئی۔ اور دونوں میں تصادم کا زبردست خطرہ پیدا ہو گیا۔ لیکن وقت پر پولیس خاصی تعداد میں جائے واردات پر پہنچ گئی۔ اور دونوں کو وہاں سے مُنتشر کرنے کا حکم دیا۔ دونوں نے جب ہٹنے سے انکار کیا تو پولیس نے لاٹھی برسائی۔ اس میں گھانچیوں کی زیادہ زدوکوب ہوئی (سندھی منتشر ہونے لگے تھے لیکن گھانچی اپنی جگہ سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھے) اور پولیس مسجد میں بھی داخل ہو گئی۔
دوبارہ گودھرا پر ہمہ وقت کرفیو لگا دیا گیا اور مسلم علاقوں اور بوہرہ محلے پر اس معاملے

میں زیادہ سختی برتی گئی۔ ہندو علاقوں سے ۹ گھنٹے کے لیے کرفیو ہٹا دیا جاتا تھا جبکہ ان علاقوں کو یہ رعایت نہیں دی جا رہی تھی۔ بوہروں اور گھانچیوں نے حکام کے پاس اس سلسلے میں ایک وفد بھیجنے کا طے کیا۔ ۲۴ راگست کو اس علاقے میں مسز سورنا کانتا جو اس ضلع کی کلکٹر ہیں وہاں آنکلیں اور بوہرہ عورتوں نے ان سے کرفیو نہ ہٹانے کی اور اس سے پیش آنے والی مشکلات کی شکایت کی مسز سورنا کانتا نے ان کی بات پوری ہمدردی سے سُنی۔ اور کرفیو ہٹا لینے کا وعدہ بھی کیا۔ لیکن باوجود اس کے کہ اس علاقے میں کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا دوسرے دن بھی کرفیو نہیں ہٹایا گیا۔ دوسرے دن ٹاور کے قریب پولیس انسپکٹر دورے پر آیا تو بوہرہ عورتوں اور نوجوانوں نے کلکٹر سے گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے کرفیو ہٹانے کی دوبارہ درخواست کی۔ پولیس انسپکٹر سے بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ دوسری طرف سے ضلع ڈی۔ ایس۔ پی آنکلا جس کے ساتھ کئی مردانہ اور زنانہ پولیس تھی۔ آتے ہی اُس نے چیخنا اور لوگوں کو کرفیو کی نافرمانی کے الزام میں پکڑنا شروع کر دیا۔ عورتیں گھبراہٹ میں چاروں طرف بھاگنے لگیں۔

کچھ نوجوان جو آس پاس کے گھروں سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے ڈی۔ ایس۔ پی کی اس حرکت پر ناراض ہو کر اوپر سے پتھراؤ شروع کر دیا جس کی وجہ سے کچھ پولیس کے لوگ زخمی ہو گئے اس پر ڈی ایس پی غصے میں اپنے ہوش کھو بیٹھا اور ایس۔ آر۔ پی کو حملہ کرنے کی کھلی چھٹی دیدی۔ پھر کیا تھا۔ آر۔ ایس۔ پی کے جوان گھروں میں گھس پڑے اور عورتوں، بچوں کو نہ صرف بُری طرح پیٹا بلکہ کیبنوں کے تالے توڑ کر مبینہ طور پر قیمتی کپڑے، زیور بھی لوٹ کر لے گئے۔ سارے محلے پر خوف طاری ہو گیا۔ پولیس نے یہ الزام لگایا ہے کہ محلے میں ایک مکان سے ۲۰ کیلو گرام کا پتھر پھینکا گیا لیکن محلے والوں کا کہنا ہے کہ اگر اتنا بھاری پتھر پھینکا گیا ہوتا تو پولیس افسر کی صرف کھوپڑی فریکچر نہ ہوتی بلکہ وہیں وہ دم توڑ دیتا اور اتنا بھاری پتھر زمین پر گر کر اپنا نشان بناتا جو کہیں نہیں پایا گیا۔

گودھرا آج بھی فرقہ واریت کی مسموم فضا میں سانس لے رہا ہے اور کرفیو کی گھٹن میں جی رہا ہے آخر یہ کب تک؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ سنجیدہ شہری پہل کریں اور امن قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے بنیادی مسئلوں کو حل کرنا ضروری ہوگا کہ تلخی کا احساس کم ہو سکے۔ وہ چاہے دو کانوں کا معاملہ ہی کیوں نہ ہو۔

ستمبر ۱۹۸۱ء

احمد آباد میں پھر فرقہ وارانہ فساد

۱۹۶۹ء میں احمد آباد میں بڑا خطرناک فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا۔ اس فساد میں جہاں کروڑوں کی ملکیت کا نقصان ہوا وہاں سینکڑوں جانیں بھی ضائع ہوئیں۔ اس کے بعد اتنے بڑے پیمانے پر احمد آباد میں فرقہ وارانہ فساد تو نہیں ہوا لیکن چھوٹے موٹے واقعات رونما ہوتے ہیں اور تناؤ بھی بنا رہتا ہے۔ اسی شہر میں پچھلے سال بہت بڑے پیمانے پر ذات پات کو لیکر بہت بڑا فساد ہوا اور اچھوتوں کا جینا دوبھر کر دیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احمد آباد میں ایک طرف اچھوتوں کے خلاف اور دوسری طرف مسلم اقلیت کے خلاف گاہے بگاہے فسادات کیوں ہوتے رہتے ہیں؟ ویسے تو گجرات کے کئی شہر فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال ہی گودھرا (ضلع پنچ محل) اور بڑودہ میں بھی بڑے پیمانہ پر اس نوعیت کے فسادات ہو چکے ہیں۔ یہاں ہم احمد آباد شہر میں ہونے والے فسادات کا تجزیہ کرتے ہوئے وہاں ہونے والے حالیہ فساد پر روشنی ڈالیں گے۔

احمد آباد گھنی آبادی والا شہر ہے جہاں بڑے پیمانے پر کپڑے کی صنعت پائی جاتی ہے دیہاتوں سے اکثر لوگ روزگار کی تلاش میں کپڑا ملوں کے اس مرکز میں وارد ہوتے رہتے ہیں۔ دیہاتوں سے ہجرت کرنے والوں میں اکثریت ہریجنوں اور مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کپڑا ملوں میں مزدوروں کی کثیر تعداد ہریجنوں (جو بنکر ذات سے تعلق رکھتے ہیں) اور مسلمانوں کی ہے۔ مزدوری کی تلاش میں یہاں شمالی ہندوستان سے بھی کافی لوگ آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یو۔پی کے بھیا بھی خاصی تعداد میں ان ملوں میں کام کرتے ہیں۔ ۱۹۶۹ء کے فسادات میں انہی بھیاؤں کو

مسلمانوں کے خلاف اکسایا گیا تھا تاکہ وہ مل کی آسامیوں پر قبضہ کر سکیں۔

ہمیں یہاں احمد آباد شہر کے کردار کو بھی ذہن نشین کرنا ہوگا۔ احمد آباد گجرات کا ایک بہت بڑا تجارتی مرکز ہے اور یہاں ایک بہت بڑی تعداد وسطی درجے اور نچلے وسطی درجے کے چھوٹے موٹے بیوپاریوں کی پائی جاتی ہے۔ یہ چھوٹے بیوپاری سماجی اور مذہبی اعتبار سے بڑے دقیانوسی ہوتے ہیں اور غیر مذہب والوں کے خلاف بڑا تعصب رکھتے ہیں۔ جنگ سنگھ (جس کا نیا نام بی جے پی ہے) اور آر ایس ایس نچلے درجے کے انہی چھوٹے چھوٹے بیوپاریوں میں زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔ ان لوگوں میں ہریجنوں اور مسلمانوں کے خلاف بڑا تعصب پایا جاتا ہے جس کا فائدہ فرقہ پرست جماعتیں اٹھاتی رہتی ہیں۔ شمالی گجرات کے پٹیل بھی خاصے متعصب ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پٹیل ہندو ذات پات کے نظام میں نچلے درمیانے درجے کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشی اور سماجی اعتبار سے تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اسی تناسب سے ان کی سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی اُمنگیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ گجرات میں عموماً اور احمد آباد میں خصوصاً آر ایس ایس کے اراکین کی خاصی تعداد پٹیل کمیونٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ ہریجنوں اور مسلمانوں کے خلاف رونما ہونے والے فسادات میں پٹیلوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

احمد آباد شہر میں مسلمانوں میں غربت بہت زیادہ ہے۔ گجرات یونیورسٹی کے ماہر معاشیات پروفیسر لالی والا نے احمد آباد کے مسلمانوں کا نمونے کے طور پر ایک سروے کیا تھا۔ اس سروے کے مطابق ۷۵ فیصد مسلمان مفلسی کے خط کے نیچے پائے جاتے ہیں۔ اس سروے کے لیے ۱۹۷۲ء کو قیمتوں کے اعتبار سے بنیادی سال (BASEYEAR) بنایا گیا تھا۔ آج تو ۱۹۷۲ کے مقابلے میں زر کا پھیلاؤ اور قیمتوں میں اضافہ بہت زیادہ ہوا ہے۔ مجرم پیشہ لوگ اس بھیانک غربت کا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں اور ہریجنوں کو جرائم پیشہ کاموں میں شامل کرتے ہیں۔ کئی پٹیل شراب اور جوئے کے اڈوں کے مالک ہیں اور ان کے حکمراں طبقوں اور پولیس افسروں سے بڑے گہرے تعلقات ہوتے ہیں۔ ادھر کچھ مسلمان بھی شراب اور جوئے کے اڈے چلاتے ہیں۔ اس طرح پٹیلوں اور مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں پیشہ ورانہ دشمنی پائی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں دو فرقوں میں بھی اکثر تناؤ بنا رہتا ہے۔ اور آئے دن چھوٹے موٹے واقعات اور جھڑپیں ہوتی

رہتی ہیں۔

لیکن یہ پیشہ ورانہ دشمنی سیاسی اقتدار کی رسہ کشی کی وجہ سے کبھی کبھی بڑی خطرناک صورت اختیار کرلیتی ہے۔ ۱۹۶۹ء میں جن سنگھ، کانگریس (او) اور اندرا کانگریس میں اقتدار کی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور جن سنگھ اور آر ایس ایس نے مسلم دشمنی کو اقتدار کی اس جنگ میں اپنا ہتھیار بنایا اور سخت فرقہ وارانہ منافرت پھیلا کر اتنے بڑے پیمانے پر فساد کروادیا۔

۱ر جنوری ۱۹۸۲ء کو شروع ہونے والے فساد میں بھی بی جے پی اور آر ایس ایس کی سیاست کام کررہی ہے۔ اس فساد کی شروعات پتنگ بازی سے متعلق دو گروہوں میں جھگڑے کی وجہ سے دریاپور کے علاقے میں ہوئی۔ پتنگ بازی پر جھگڑا تو ایک بہانہ تھا۔ فساد کی تیاری ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چند ہفتوں سے ہورہی تھی۔ دریاپور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی ہے اور دریاپور کا ایک حصہ آر ایس ایس کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ٹھیلوں اور مسلمانوں کے شراب اور جوئے کے اڈے بھی پائے جاتے ہیں۔

گجرات میں اس وقت کانگریس آئی کی حکومت ہے جسے راجپوتوں، ہریجنوں، آدی واسیوں اور مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔ بی جے پی اور آر ایس ایس فرقہ وارانہ مسائل کو اچھال کر گجرات کی سیاست میں اپنا وزن بڑھانا چاہتی ہیں۔ چند ہفتوں پہلے احمد آباد میں وشو ہندو پریشد کی کئی شاخیں قائم کی گئی ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس پریشد کے زیادہ تر فعال اراکین آر ایس ایس سے تعلق رکھتے ہیں۔ دو ہفتے پہلے نیل کنٹھ مہادیو کے احاطے میں وشو ہندو پریشد کے جھنڈے تلے ایک بہت بڑی میٹنگ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس میٹنگ میں بولنے والوں میں گئو بھگت شمبھو مہاراج اور رامائن کے مشہور گائک مُراری باپو بھی شامل تھے۔ ہندو وشو پریشد کا قیام ہریجنوں کے اسلام قبول کرنے کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے عمل میں آیا ہے۔ احمد آباد میں محلّے محلّے میں اس کی شاخیں قائم کی جارہی ہیں اور بڑے پیمانے پر اس کے لیے فنڈ جمع کیا جارہا ہے۔ احمد آباد شہر کے جی ایل ایس آرٹس کالج کے ایک لکچرار نے مجھے بتایا کہ خود اُس کے ساتھی لکچرار پریشد کے لیے بڑے جوش و خروش سے پیسہ جمع کررہے ہیں۔ پہلے کبھی ہمارے کالج میں کسی فرقہ وارانہ تنظیم کے لیے اس طرح پیسہ جمع نہیں کیا گیا۔

ہندو وشو پریشد نے شہر کی دیواروں پر ہزاروں پوسٹر چسپاں کیے ہیں۔ اس پوسٹر میں ہندوستان کے نقشے کو گیروے رنگ میں دکھایا گیا ہے جس کے درمیان اوم (ॐ) کا نشان بنا ہوا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نقشے میں پاکستان اور بنگلہ دیش کو بھی اسی رنگ میں شامل کیا گیا ہے۔ اس پوسٹر کا عنوان ہے "ہم سب ہندو ایک ہیں" انکم ٹیکس آفس کے پاس گرہ نرمان آفس کی دیواروں پر بڑے بڑے حرفوں میں یہ نعرے لکھے ہوئے ہیں! "رام نام بولو یا ہندوستان چھوڑو" "تو ہندوے ماترم گانا ہوگا یا بھارت سے جانا ہوگا" یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایسے نعرے فرقہ واریت کا زہر کتنی تیزی سے پھیلا سکتے ہیں۔

پریشد کی طرف سے بہت بڑے پیمانے پر پرچے بھی تقسیم کیے گئے ہیں۔ تبدیلیٔ مذہب کی مذمت کرتے ہوئے ایک پرچہ میں سوامی وویکا نند کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "ہندو سماج سے ایک شخص کا نکل جانا صرف ایک شخص کی کمی ہو جانا نہیں بلکہ ایک دشمن کا اضافہ ہے"۔ اس پرچے میں ہندو مذہب اور تہذیب کے دفاع کے لیے ہندوؤں سے پرزور اپیل کی گئی ہے۔ ایک دوسرے پرچے میں زیادہ اشتعال انگیز زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس پرچے میں کہا گیا ہے کہ تبدیلیٔ مذہب کا یہ عمل ایک ہزار سال سے جاری ہے۔ اس کا دور محمد غوری سے اورنگ زیب تک اور جناح سے لیکر یحییٰ خان تک پھیلا ہوا ہے (دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں جنرل ضیاء الحق کا نام نہیں لیا گیا۔ شاید وشو پریشد والوں کو اپنے امریکن آقاؤں سے ڈر لگ رہا ہوگا) پرچے میں آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ اب عربوں کے پیٹرو ڈالر اسی عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہاں مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کے بہانے کروڑوں روپے بھیجے جا رہے ہیں جو ہریجنوں کو اسلام قبول کرانے کے کام پر خرچ ہوتے ہیں۔ اس پرچے کے مطابق آسام میں بھی لاکھوں مسلمانوں کو داخل کرنے کی سازش جاری ہے اور سارے مشرقی ہندوستان کو مسلم پردیش بنانے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔

ظاہر ہے یہ ہندوؤں کو اشتعال دلانے والی زبان ہے۔ اس کے بڑے خطرناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ احمد آباد میں کئی صاف ستھری ذہنیت رکھنے والے ہندوؤں نے بھی اس خطرے کو محسوس کیا، موہن ٹلوئی نے، جن کا پٹیل کمیونٹی سے تعلق ہے، شہر کے ایک گجراتی اخبار کو اس خطرے

سے آگاہ کرنے کے لیے ایک خط بھی لکھا جس میں حکومت سے بھی اس قسم کے فرقہ وارانہ پروپیگنڈا کو روکنے کی درخواست کی گئی تھی۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ اخبار نے ابھی تک یہ خط نہیں چھاپا نہ حکومت نے ہی اس زہریلے پروپیگنڈہ کے خلاف کوئی قدم اٹھایا۔

آخر نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ فرقہ وارانہ فضا تیار ہوئی اور پتنگ بازی کے واقعے کو بہانہ بنا کر فساد پھوٹ پڑا جس کے نتیجے میں اب تک دو آدمی ہلاک اور کئی زخمی ہو چکے ہیں۔ دریاپور اور کالوپور کے علاقوں میں چھرے بازی کی وارداتیں بھی پیش آرہی ہیں۔ دریاپور کے علاقے میں ۱۱۱ نمبر کی بس کو روک کر کئی مسافروں کو زخمی کر دیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت نے فوری اقدام کر کے فی الحال فساد کو پھیلنے سے اور شدید صورت حال اختیار کرنے سے روک لیا ہے لیکن یہ امن پائیدار ثابت ہونا مشکل ہے۔

بڑھتے ہوئے معاشی اور سیاسی بحران کے پیش نظر فرقہ وارانہ طاقتیں اپنا سر اٹھا رہی ہیں یہ حکمراں طبقوں کے مفاد میں بھی ہے کہ فرقہ واریت کو ہوا دے کر لوگوں میں فرقہ وارانہ شعور پیدا کیا جائے اور انھیں آپس میں لڑایا جائے۔ اس سے طبقاتی شعور کی بھی بڑی آسانی سے روک تھام ہو جاتی ہے۔ یہ عوامی طاقتوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ بڑھتے ہوئے معاشی بحران میں فرقہ وارانہ شعور خانہ جنگی کی صورت پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف فرقہ وارانہ فسادات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور دوسری طرف ہریجنوں کے قتل عام ہیں۔ اس کا توڑ عوامی جدوجہد کو تیز کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ بائیں بازو کی اور جمہوری طاقتوں کی یہ ذمّے داری ہے ورنہ ذات پات اور فرقہ واریت کا زہر بہت تیزی سے ہماری رگوں میں سرایت کر جائے گا۔

دسمبر ۱۹۸۱ء

پونا اور شولا پور
فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں

۱۹۶۹ء میں ملک میں فرقہ واریت کا زہر تیزی سے پھیل گیا تھا اور اسی کے نتیجے میں اور مقامات کے علاوہ احمد آباد، بھونڈی اور جل گاؤں میں بڑے فسادات ہوئے جن میں سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں بینکوں کو قومیایا گیا تھا۔ اور ملک کی معاشی پالیسی میں بنیادی تبدیلی کی بات کی جا رہی تھی گویا اس وقت ملک ایک نئی سیاسی کروٹ لینے کی تیاری کر رہا تھا تاکہ وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ ٹھیک اسی زمانے میں جن سنگھ نے ایک طرف مسلمانوں کو ہندیانے (INDIANI SATION) کی قرارداد پاس کر کے اور دوسری طرف مشترکہ سول کوڈ کا زور شور سے مطالبہ کر کے ملک کی فضا کو فرقہ واریت کے زہر سے مسموم کر دیا تھا۔

آج ملک پھر بحرانی دور سے گذر رہا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے متحدہ محاذ بن بگڑ رہے ہیں اور جن سنگھ بھی مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے اپنے چہرے پر لگے فرقہ واریت کے داغ پر سیکولرزم کا غازہ مل رہی ہے۔ لیکن یہ سیاسی میک اپ شاید ہی کسی کو دھوکا دے سکے۔ جن سنگھ نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے روپ میں نیا سیاسی جنم لیا ہے۔ لیکن اعمال وہی ہیں جو پہلے جنم میں تھے۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے جن سنگھ کے لیڈر خود براہِ راست فرقہ واریت کا زہر اگلتے تھے۔ اب وہ یہ کام نئے غیر سیاسی مورچے بنا کر کرنا چاہتے ہیں۔ ہندو وشو پریشد، پتیت پاون وغیرہ اسی قسم کی تنظیمیں ہیں جنہوں نے فرقہ واریت کا زہر پھیلانے کا بیڑا زور شور سے اٹھایا ہے۔ ہندو پریشد ہندو ایکتا کے نام پر سارے ملک میں اپنا جال بڑی تیزی سے پھیلا رہی ہے۔

پچھلے سال کے اواخر میں دہلی میں اس کی طرف سے رام لیلا گراؤنڈ میں بہت بڑے پیمانے پر میٹنگ کی گئی تھی جس کی صدارت سابق کانگریسی مسٹر کرن سنگھ نے کی تھی۔ اس میٹنگ کے بعد ہندو پریشد کا جال بڑی تیزی سے سارے ملک میں پھیلایا جا رہا ہے۔ ہر بڑے شہر میں پوسٹر لگائے جا رہے ہیں جن میں ہندوستان کا نقشہ بھگوے رنگ میں دکھایا جاتا ہے اور جس کے بیچوں بیچ اوم کی صورت بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اس نقشے میں پاکستان، بنگلہ دیش، آسام وغیرہ کو بھی شامل کیا گیا ہے گویا وہی اکھنڈ بھارت والی بات ہے، حیرت کی بات تو یہ ہے کہ حکومت اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہی ہے۔

دسمبر میں ایسے پوسٹر بڑی تعداد میں احمد آباد شہر میں لگائے گئے تھے اور ہندو وشو پریشد کی بڑی میٹنگ کی گئی تھی اور اس کے چند دنوں بعد ہی احمد آباد میں فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں چار افراد مارے گئے اور کئی زخمی ہوئے۔ اس کے فوراً بعد بمبئی کی دیواروں پر بھی یہ پوسٹر بڑی تعداد میں لگے ہوئے دیکھے گئے۔ بمبئی کی دیواروں پر یہ نعرے بھی لکھے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں: "جب ہندو جاگے گا اس دیش کا دکھ بھاگے گا"۔ "ہم ہندو ہیں اور ہمیں اس بات پر فخر ہے"۔ "ہندو ایکتا زندہ باد"۔ قومی ایکتا کی جگہ ہندو ایکتا کی بات اور دیش کے دکھ ختم کرنے کے لیے ہندوؤں کو جگانے کی بات کوئی اچانک واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک سوچی سمجھی کل ہند پیمانے پر کی جا رہی سازش کا نتیجہ ہے۔ ہمیں پونا اور شولا پور کے حالیہ فساد کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ ہم پونا اور شولا پور کے فسادات کے متعلق گفتگو کرنے سے پہلے ہندو وشو پریشد کے متعلق چند اور اہم اور بنیادی باتیں کرنا چاہیں گے۔

ہندو وشو پریشد ویسے بہت پرانی تنظیم ہے۔ لیکن ابھی تک یہ تنظیم سیاسی سطح پر یا سیاسی مقاصد کو سامنے رکھ کر کام نہیں کرتی تھی۔ ہندو مذہب اور فلسفے کا پرچار اور ہندو ایکتا کے لیے کوشش اس کے اغراض و مقاصد میں شامل تھا۔ لیکن اسلامی اساسیت کی تحریک (ISLAMIC FUNDAMENTALISM) کے بعد عموماً اور مینا کشی پورم میں تبدیلیٔ مذہب کے واقعے کے بعد خصوصاً بی جے پی اور آر ایس ایس نے اس تنظیم کو اپنے سیاسی مقصد کے لیے بڑے پیمانے پر استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اب اس تنظیم کے ذریعے تبدیلیٔ مذہب کے خلاف بڑا جارحانہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اور ہندوستان میں اسلامی اساسیت کا حوا

کھڑا کر کے ہندوؤں کو متحد ہو جانے کی تنبیہہ کی جا رہی ہے۔ ایک طرف پس ماندہ، اور غربت کا شکار عوام کا دباؤ حکومت پر پڑ رہا ہے کہ وہ ان کے مسائل حل کرنے کے لیے ترقی پسند سیاسی اور معاشی پالیسی اختیار کرے اور ہندوستان کے معاشی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی کرنے کی سمت میں تیزی سے قدم اٹھائے اور دوسری طرف آر ایس ایس جیسی رجعت پسند طاقتیں تبدیلئ مذہب کو بنیادی مسئلہ بنا کر ہندو عوام میں اور خاص طور سے ہندو نچلے متوسط اور متوسط طبقوں میں مسلمانوں کے خلاف سخت تعصب پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں تاکہ معاشی تبدیلی پیدا کرنے کے مسئلے سے توجہ ہٹ کر ایسے جذباتی مسائل میں ہندو عوام کو الجھا دیا جائے۔ احمد آباد، پونا جیسے شہروں میں ہندوؤں کے نچلے متوسط اور متوسط طبقوں پر ہندو وشو پریشد کے جارحانہ پروپیگنڈا کا بڑا اثر ہو رہا ہے۔

پونا میں کئی متوسط طبقے کے ہندوؤں سے ملا۔ یہ لوگ مشترکہ سول کوڈ اور خاندانی منصوبہ بندی کے مسائل پر پھر سے زور دے رہے ہیں۔ مہاراشٹر قانون ساز اسمبلی کے ممبر مسٹر انا پاٹل جو پہلے کانگریس ایس میں تھے اور اب اس سے مستعفی ہو کر آزاد ممبر ہیں مہاراشٹر کے شہروں میں زور شور سے یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ ایک طرف مسلمان چار شادیاں کر دوسری طرف خاندانی منصوبہ بندی کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں اس کی وجہ سے ان کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے آزادی کے وقت ان کی آبادی ۳ کروڑ تھی اور آج تیرہ کروڑ ہو گئی ہے۔ (سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مسلم آبادی صرف ۸ کروڑ ہے)۔ بہت جلد ہندو اس ملک میں اقلیت میں رہ جائیں گے اور خاص طور سے اس لیے کہ اب تو عرب پیسوں کی مدد سے ہریجنوں کو لالچ دیکر مسلمان بنایا جا رہا ہے۔ شولاپور میں ۹ فروری کو مسٹر انا پاٹل نے ایک بہت بڑی میٹنگ کو طلب کرتے ہوئے یہ باتیں کہیں تھیں۔ اور وہاں ۱۳ فروری کو فرقہ وارانہ فساد کی شروعات ہوئی۔

ہندو وشو پریشد کی طرف سے تبدیلئ مذہب کے مسئلے کو خاص طور سے اچھالا گیا ہے۔ اور ہندوؤں کو تبدیلئ مذہب کی روک تھام کے لیے کمربستہ ہونے کی تنبیہہ کی جا رہی ہے ہندو وشو پریشد کے رضا کار چندہ اکٹھا کرنے کے بہانے سے گھر گھر جاتے ہیں اور پیسہ ملے یا نہ ملے پیسہ اکٹھا کرنا تو محض بہانہ ہے کیوں کہ انہیں پیسہ تو بے تحاشہ امریکی آقاؤں سے مل رہا ہے جیسا کہ

وزیراعلیٰ شری بھوسلے نے خود پونا میں ایک میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا) ۱۵ منٹ اس مسئلے پر لیکچر دیتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بہت جلد اس ملک میں ہندو اقلیت میں رہ جائے گا۔ شولاپور میں ہمیں جنتا پارٹی کے کچھ اراکین نے بتایا کہ یہاں اس قسم کی مہم کئی دنوں سے چل رہی ہے اور یہ فرقہ وارانہ فساد اسی زہریلی فضا کا نتیجہ ہے۔

اب پہلے ہم پونا کے فساد کی طرف آتے ہیں۔ ڈاکٹر بابا آڈھو کا کہنا ہے کہ وشو ہندو پریشد اور پتت پاون یہ دونوں آر ایس ایس کی فرنٹ آرگنائزیشن ہیں۔ اس بات کی تصدیق شری ایس۔ ایم۔ جوشی نے بھی کی۔ ان دونوں تنظیموں نے مل کر ۱۴ فروری کو جلوس نکالا تھا۔ بھائی ویدیا جنتا پارٹی کے جنرل سکریٹری نے مجھ سے کہا کہ اس جلوس کے متعلق دلچسپ بات یہ تھی کہ اس میں گاندھی جی، امبیڈکر، گرو گولوالکر، مہاتما پھُلے اور گرو گووند سنگھ کی تصویریں ہندو اتحاد جتانے کے لیے ایک ساتھ نکالی گئی تھیں۔ اور اس میں منوسمرتی کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ بھائی ویدیا نے کہا کہ گرو گولوالکر کا مہاتما پھُلے اور امبیڈکر اور گاندھی جی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ گولوالکر ہندو مسلم اتحاد کے دشمن اور ذات پات کے قائل جبکہ امبیڈکر، مہاتما پھُلے اور گاندھی جی ذات پات کے خلاف اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ یہ کبھی ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ یہ لوگوں کو محض دھوکا دینے کی ایک چال تھی۔

اس جلوس میں، ویدیا نے کہا کہ کانگریس آئی، جنتا پارٹی اور بی جے پی کے نمائندے بھی شریک ہوئے تھے حالانکہ بھائی ویدیا نے جنرل سکریٹری کے طور پر جنتا پارٹی کے ممبروں سے اپیل کی تھی کہ وہ ہندو وشو پریشد سے جو کہ ایک فرقہ وارانہ تنظیم ہے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ اس جلوس میں، ڈاکٹر اڈھو نے بتایا کہ بڑے اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے۔ "پاکستان مردہ باد"۔ "یہ دیش نہیں کسی کے باپ کا، یہ ہے ہندوؤں کا"۔ "ایک دھکا اور دو، پاکستان توڑ دو" کے علاوہ کچھ نعرے ایسے لگائے گئے جس میں فحش گالیاں بکی گئی تھیں جنہیں یہاں دہرانا ممکن نہیں ہے اور یہ فحش گالیاں لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ مراٹھی میں قافیہ ملا کر دی جا رہی تھیں۔ اس کے باوجود، بابا اڈھو نے بتایا کہ مسلمان بالکل مشتعل نہیں ہوئے کیونکہ وہ خوفزدہ تھے۔ اُن میں سے کئی مسلمان تو اپنا گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پولیس کمشنر نے پہلے

جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ پونہ کارپوریشن کے میئر اور ڈپٹی میئر نے کمشنر پر دباؤ ڈال کر اجازت دلوائی۔ جنتا پارٹی کے ہی ایک اور کارکن نے مجھے بتایا کہ پریشد کا جلوس جب آزاد چوک سے گذرا تو جلوس میں شامل کچھ لوگوں نے چوک میں مولانا آزاد کے نام کی جو تختی لگی تھی وہ توڑ کر پھینک دی۔ بھائی ویدیا نے اس کی مذمت کرتے ہوئے امن کمیٹی کی ایک میٹنگ میں کہا کہ مولانا آزاد کی وہ شخصیت ہے کہ یہ مہاتما گاندھی سے بھی پہلے دیش کی آزادی کی لڑائی میں شریک ہوئے تھے اور ہندو مسلم ایکتا پر زور دے رہے تھے۔

یہ جلوس جب ڈیکن جمخانہ کی طرف سے گذرا (حالانکہ اسے ادھر سے نہیں گذرنا تھا) تو اچانک دو ایرانی ہوٹلوں پر حملہ کر دیا اور انہیں جلا کر خاک کر دیا۔ بابا آڈھو نے بتایا کہ یہ حملہ ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھا۔ دوسرے دن رات کو جب کرفیو لگا ہوا تھا ایک بوہرے کی دوکان جلا دی گئی جس میں تقریباً چار سے پانچ لاکھ کا نقصان ہوا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ پونا کے مسلمان معاشی اعتبار سے بے حد کمزور ہیں۔ پونا میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۸۰ ہزار ہے (پونا کی کل آبادی ۱۲ لاکھ کے قریب ہے) اکثر مسلمان جھونپڑوں میں رہتے ہیں اور چھوٹے موٹے کارخانوں میں کام کرتے ہیں یا پھیری کا کام کرتے ہیں بابا آڈھو نے بتایا کہ مسلمانوں اور ہریجنوں کو اکثر کوئی ملازمتیں نہیں دیتا۔ آج پونا میں کئی بڑے بڑے کارخانے ہیں لیکن ان میں آپ کو افسروں کے عہدے پر کوئی مسلمان یا ہریجن نظر نہیں آئے گا اور ثبوت کے طور پر انہوں نے ٹیلیفون ڈائریکٹری پیش کر دی۔ افسروں کے عہدوں پر تو چھوڑیئے، انہوں نے یہ بتایا کہ ان کارخانوں میں انہیں اکثر مزدوروں کا کام بھی نہیں مل پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ناجائز شراب کے دھندے میں اور عصمت فروشی کے پیشے میں مسلمانوں کی تعداد پونا میں بڑھتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کو کوئی رہنے کے لیے بھی جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مشرقی پونہ کے غریب ترین علاقوں میں رہتے ہیں اور یہاں سے باہر نکلنے کا ان کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے۔ بعض مسلمانوں کی معاشی حالت اتنی گر گئی ہے کہ میونسپلٹی کے جھاڑو لگانے والے ہریجن جنہیں پانچسو روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے، وہ ان مسلمانوں کو دوسو روپے ماہوار پر جھاڑو لگانے کا کام دے دیتے ہیں اور مسلمان غنیمت سمجھ کر یہ کام ۲۰۰ روپے ماہوار پر

خوشی سے کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

بابا آڈھو کا کہنا ہے کہ کئی مہینوں سے پونا کی فضا خراب کرنے کی منظم کوشش کی جا رہی تھی اور حکومت نے ویسے بھلے ہی حالات پر قابو پا لیا ہو لیکن ہندو وشو پریشد جو زہر پھیلا رہی ہے اس کا توڑ کرنا ضروری ہے۔ ویسے حکومت نے وشو پریشد اور پتیت پاون پر پابندی بھی عائد کر دی ہے لیکن صرف پابندی عائد کرنے سے ہی اس کا توڑ نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سیکیولرزم پر اعتماد رکھنے والے لوگ بھی اتنا ہی جارحانہ پروپیگنڈہ کریں اور ان فرقہ پرست جماعتوں کی اصلیت کو بے نقاب کریں تب کچھ بات بن سکتی ہے۔ لیکن آج پونا میں بابا آڈھو، ایس، ایم جوشی اور بھائی ویدیا جیسے لوگ بہت کم تعداد میں ہیں جو اپنی سیاست سے ہٹ کر اُصولوں کی خاطر اور انسانیت کی خاطر لڑنے کے لیے تیار ہوں۔

اب ہم شولاپور کے فساد کا ذکر کریں گے۔ ۱۷ فروری کو راقم الحروف ایس ایم جوشی، موہن دھاریہ، ببن راؤ ڈھکنے (حزب مخالف کے لیڈر) بھائی ویدیہ اور بابا آڈھو ہم سب فساد کی تحقیقات کے سلسلے میں شولاپور گئے۔ شولاپور کے کلکٹر اور ڈی ایس پی نے فساد کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ۱۵ فروری کو ہندو پریشد نے جلوس نکالا۔ جلوس دن کو ڈھائی بجے شروع ہوا اور شام تک گشت لگاتا رہا۔ پنجاب تعلیم مسجد کے آس پاس آکر اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے۔ کلکٹر نے پہلے جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ لیکن پریشد کے لیڈروں کی اس یقین دہانی پر کہ جلوس پُرامن رہے گا اور اشتعال انگیز نعرے نہیں لگائے جائیں گے جلوس نکالنے کی اجازت دی گئی تھی۔ مسجد کے پاس اچانک نعرے لگانے شروع کئے لیکن اس کے باوجود مسلمان مشتعل نہیں ہوئے۔ پھر تلک چوک میں ایک مسلمان کی ہاتھ گاڑی کو آگ لگائی گئی اور پھر وہیں قریب میں واقع ایک پان کی دوکان اور کولڈرنک ہاؤس کو نذر آتش کر دیا گیا۔ یہ واقعات تلک چوک کے آس پاس رات کو آٹھ بجے پیش آئے۔ ایک ہیئر ڈریسنگ سیلون اور ریڈی میڈ کپڑے کی دوکان بھی جلائی گئی۔

اس کے بعد مسلمانوں نے جوابی کارروائی شروع کی۔ گرووار پیٹھ اور شکروار پیٹھ میں ایک کپڑے اور ایک برتن کی دوکان جو ہندوؤں کی تھیں آگ لگا کر جلا دیا گیا۔ آتش زنی کے واقعات

سے گردوار پیٹھ میں سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ مسلمانوں کا مالی نقصان کم ہوا اس لیے کہ شولا پور میں بھی مسلمان غریب ہیں اور ان کی چند چھوٹی موٹی دوکانیں ہیں۔ لیکن ظاہر ہے ہندوؤں کی دوکانیں خاصی بڑی ہیں اور ان میں مال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ شولا پور میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ساٹھ ہزار ہے۔ چند بیڑی کے کارخانوں کے مالکوں کو چھوڑ کر یہاں بھی مسلمانوں کی مالی حالت بہت خراب ہے۔ اکثر بیڑی کے کارخانوں میں مزدوری کرتے ہیں یا کپڑا ملوں میں اکثر ملی جلی آبادیاں ہیں۔ شولا پور میں اس سے پہلے بڑا فساد ۱۹۶۷ء میں ہوا تھا اور اس میں تقریباً ۱۲ آدمی مارے گئے تھے۔ ہر سال گنپتی کا جلوس جب پنجاب تعلیم مسجد کے پاس سے گذرتا ہے تو تناؤ رہتا ہے۔ اس مرتبہ بھی اسی مسجد کے پاس جلوس میں شریک لوگوں نے اشتعال انگیز نعرے لگائے اور فساد کی شروعات ہوئی۔ ہم لوگ شولا پور پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ اور کرفیو لگا ہوا تھا۔ کلکٹر کا کہنا تھا کہ حالات بالکل قابو میں ہیں اور آج کا کرفیو (یعنی ۱۷ فروری کی رات) محض احتیاطاً لگایا گیا ہے۔ فساد کے دوران سنگ باری کے واقعات پیش آئے اور پولیس نے دو بار گولی چلائی جس میں چار آدمی زخمی ہوئے۔ پولیس نے گولی بھیڑ کو تتر بتر کرنے کے لیے چلائی تھی۔ فساد کے پہلے دن ۱۹۵ افراد گرفتار کیے گئے اور دوسرے دن ۱۹۶۔ گرفتار ہونے والوں میں اکثریتی فرقے کے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ایسا کچھ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا۔ شولا پور کے کچھ لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اس فساد سے پہلے ۹ فروری کو اناپاٹل نے ایک عام جلسے میں بڑی اشتعال انگیز تقریر کی تھی اور اس کے بعد رام مندر میں دو میٹنگیں ہوئیں جس میں فساد کی سازش کا منصوبہ بنایا گیا اس میں شک نہیں کہ کلکٹر مسٹر موہن سنگھ پاٹل نے بڑی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہوئے بہت جلد حالات پر قابو پالیا ورنہ فساد اور خطرناک صورت اختیار کر سکتا تھا۔ لیکن جنتا پارٹی کے بعض کارکنوں کا کہنا تھا کہ پہلے دن پولیس کی تعداد بہت کم تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ گورنر شولا پور کے دورے پر آئے ہوئے تھے اور حفاظتی انتظامات پر کافی پولیس تعینات تھی۔

پونا اور شولا پور کے فساد میں جانی نقصان نہیں ہوا ہے لیکن یہ واقعات بڑے چونکا دینے والے ہیں۔ ہندو وشو پریشد جو زہر پھیلا رہی ہے اس کا نتیجہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ مسلم فنڈامنٹلزم کے نام پر ہندوؤں کو بھڑکایا

جا رہا ہے۔ ایس، ایم، جوشی نے مجھے بتایا کہ منظم طور پر یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ ہمیں مسلمانوں کو خوفزدہ کرنا ہی ہوگا۔ دراصل یہ کام تو تیس سال پہلے ہی ہو جانا چاہیئے تھا۔ اب اس میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ حکومت کو مؤثر طریقے پر ایسے زہریلے پروپیگنڈے کا سدِ باب کرنا ہی ہوگا۔ اور ہر وقت چوکنا رہنا ہوگا۔ ورنہ بہت جلد اور مقامات پر فسادات کا لاوا پھٹ پڑے گا۔ ساتھ ساتھ آج سیکیولرزم پر اعتقاد رکھنے والوں کے لیے بھی منظم ہو کر کام کرنا بہت ضروری ہو چکا ہے۔

فروری ۱۹۸۲ء

میرٹھ کا فساد

پی۔اے۔سی کی بربریت کا ننگا ناچ

میرٹھ فساد کے چند تجزیاتی پہلو

میرٹھ وہی شہر ہے جہاں سے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا اعلان ہندو مسلم سپاہیوں نے مشترکہ طور پر کیا تھا اور دونوں فرقے کے سپاہی متحد ہو کر دہلی میں کمپنی راج پر یلغار کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ آج وہی شہر فرقہ وارانہ منافرت کی بدترین مثال بن کر رہ گیا ہے۔ اس فساد کے ذمہ دار کون ہیں اور اس کے پیچھے کون سے عوامل کام کر رہے تھے؟ فساد میں رونما ہونے والے واقعات پر روشنی ڈالنے سے پہلے میرٹھ شہر کے پس منظر۔ سیاسی، سماجی اور معاشی ۔۔ کو سمجھنا بہت ضروری ہے فساد کے واقعات کے ساتھ ساتھ اس کے پس منظر کا معروضی تجزیہ بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

میرٹھ دہلی سے تقریباً ۴۵ میل دور واقع ہے اور اس کی آبادی اب ۵ لاکھ سے زائد ہے۔ ہندو مسلم آبادی کا تناسب ۵۱ : ۴۹ ہے یعنی میرٹھ میں مسلمانوں کی آبادی ۵۰ فیصد سے کچھ ہی کم ہے۔ حال ہی میں یو پی حکومت نے میرٹھ میونسپلٹی کو کارپوریشن میں تبدیل کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس کے چناؤ نزدیک میں ہونے والے ہیں۔ اور حالیہ فساد کے پیچھے اس چناؤ کی سیاست اور مختلف سیاسی پارٹیوں کی ریشہ دوانیوں کا بھی ہاتھ ہے۔ ہم آگے چلکر اس پر کچھ تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

اس سے پہلے ہم میرٹھ کے مسلمانوں کے معاشی حالات سے متعلق کچھ کہنا ضروری سمجھتے ہیں میرٹھ کے مسلمان تین مختلف معاشی میدانوں میں نمایاں ہیں۔ ہینڈلوم قینچی بنانے کی صنعت اور براس بینڈ کی صنعت۔ ہینڈلوم اور قینچی کی صنعت میں بڑی تعداد میں مسلمان کام کرتے ہیں اور محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ جبکہ براس بینڈ کی صنعت صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی یہاں مزدوری کرنے والے بھی مسلمان ہیں اور مالک بھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کا ایک طبقہ خاصا خوشحال ہے۔ مسلمانوں کی تعداد اور ان کے ایک طبقے کی خوشحالی اس شہر میں ان کی سیاسی اہمیت کو بڑھاتی ہے اور ایک معنیٰ میں یہ فساد کی جڑ ہے۔

دوسری طرف ہینڈلوم سے جو کپڑا تیار ہوتا ہے اس کے زیادہ تر تاجر ہندو بنئے ہیں اور یہی بنئے میرٹھ میں آر ایس ایس کے حامی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے چناؤ میں یہ چھوٹے بڑے بیوپاری اکثر بی۔جے۔پی کی حمایت کرتے ہیں۔ ایمرجنسی سے پہلے اکثر شہر کی اسمبلی کی نشست پر جن سنگھ (جو اب بی جے پی کہلاتی ہے) کا قبضہ ہوا کرتا تھا۔ ایمرجنسی کے بعد جو چناؤ ہوئے اس میں اسمبلی کی سیٹ کے لیے کانگریس۔آئی کے امیدوار منظور احمد منتخب ہوئے اور جن سنگھ کے نمائندے موہن لال کپور ہار گئے۔ تب سے موہن لال کپور ہندوؤں میں مقبول ہونے کی اور اُن کے زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

یہاں ایک اور بات پر توجہ دینا ضروری ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اس شہر میں تعداد اور خوشحالی کی وجہ سے مسلمانوں کی سیاست میں ایک خاص اہمیت ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میرٹھ شہر سے ایم۔ایل۔اے اور ایم۔پی دونوں مسلمان ہیں منظور احمد ایم۔ایل۔اے ہیں اور مرکز میں وزیر محنت محسنہ قدوائی ایم۔پی ہیں۔ میرٹھ شہر کی کانگریس۔آئی لیڈرشپ اس صورتِ حال سے خوش نہیں ہے۔ انھیں یہ احساس کھائے جا رہا ہے کہ انہیں چناؤ میں ٹکٹ نہیں دیے جاتے۔ کہا جاتا ہے (اور یہ بات میں نے میرٹھ میں کانگریس سے قریب معتبر ذرائع سے سنی) کہ اسی شکایت کے تحت شہر کانگریس۔آئی کے صدر دھرم دِواکر

اور ضلع کانگریس آئی کے صدر شانتی تیاگی کا جھکاؤ فساد کے دوران ہندو فرقہ پرستی کی طرف تھا ان کے اس رویئے کی وجہ سے متعصب ضلع حکام کو بھی مسلم دشمن رویہ اختیار کرنے کی شہ ملی۔ کانگریس۔آئی سے قریب ایک ذریعے سے یہاں تک معلوم ہوا کہ میرٹھ کانگریس آئی کے صدر مسٹر دھرم دِواکر کارپوریشن کے آنے والے چناؤ میں بی جے پی سے ساز باز کر کے میئر بن جانا چاہتے ہیں۔اس بات کی شہادت تو اکثر لوگوں نے دی کہ دھرم دِواکر اور ان کے ساتھی بی جے پی لیڈرشپ کے کافی قریب تھے۔

یہاں ایک بات اور ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔پچھلے ۲۰ سال کے دوران ہونے والے اہم فرقہ وارانہ فسادات کا جائے وقوع پر مطالعہ بتا رہا ہے کہ اب فسادات محض دو فرقوں کے درمیان فوری جھڑپ کا نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی اور منصوبہ بند سازش کا نتیجہ ہوتے ہیں جس میں طاقتور مفاد پرست عناصر شامل ہوتے ہیں۔ان فسادات کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ اکثر ان شہروں میں ہو رہے ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب زیادہ ہے اور جہاں یہ معاشی اعتبار سے بھی خوشحال ہیں اور اگر یہ دونوں باتیں ایک ساتھ ہوں تو فسادات کے امکانات اور بڑھ جاتے ہیں۔ یہ فسادات اب ایک یا دو دن نہیں بلکہ ہفتوں اور کہیں کہیں تو مہینوں تک ہوتے رہتے ہیں اور ان فسادات کے پیچھے کوئی نہ کوئی سیاسی یا معاشی نوعیت کا اہم معاملہ ہوتا ہے۔

میرٹھ کے فساد میں بھی ہمیں یہ سب باتیں نظر آتی ہیں۔ حالیہ فسادات کی ایک اور بات جتا دینا ضروری ہے۔ میناکشی پورم میں ہریجنوں کے تبدیلی مذہب کے واقعے نے ہندو فرقہ پرستوں کو بُری طرح جھنجوڑا ہے اور اب وہ شعوری طور پر ہریجنوں اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پچھلے رمضان میں دہلی میں ترکمان گیٹ کے پاس جو ہندو مسلم فساد ہوا اس میں بھی ہریجنوں اور مسلمانوں میں ٹکراؤ پیدا کیا گیا تھا اور میرٹھ میں بھی منظم طور پر یہ کوشش کی گئی۔ بالمیکی فرقے کے ہریجنوں (جنھیں عام بول چال کی زبان میں بھنگی کہا جاتا ہے) سے باقاعدہ مسلمانوں پر حملے کرائے گئے۔ مسز ہرپال سنگھ جو نانک چند کالج میرٹھ میں ایجوکیشن کی پروفیسر ہیں اور بڑی صاف ذہن سیکیولر خاتون

ہیں، مجھے بتایا کہ یہاں بالمیکیوں اور مسلمانوں میں کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ آر۔ایس۔ایس والوں نے انھیں پیسے دیکر مسلمانوں پر حملہ کرایا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان بالمیکی ہریجنوں کو ایک ایک مسلمان کو قتل کرنے کے ۲۰۰ روپے اور ایک بوتل دیسی شراب کی دی گئی ہے۔ یہ یہاں تک صحیح ہے یہ کہنا تو دشوار ہے لیکن اس سے اس بات کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے کہ آر۔ایس۔ایس اور دوسرے ہندو فرقہ پرست کیا حکمت عملی اختیار کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اب ہم ان واقعات کی طرف آتے ہیں جو بظاہر میرٹھ فساد کی بنیاد بنے۔ یہاں شاہ گھاسہ (شاہ غیاث الدین؟) نام کا ایک علاقہ ہے جس میں مسلمانوں کے گھر اور اکثر ہندوؤں کی دکانیں ہیں۔ یہ ایک تنگ سڑک ہے جس کے ایک سرے پر چند دکانوں کے بیچ ایک پیپل کا درخت ہے اور اس کے پیچھے ایک تنگ گلی میں پانی کا گہرا کنواں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں فسادات کے دوران اس کنوئیں سے کئی لاشیں برآمد ہوئی تھیں اور تب سے سردار ولبھ بھائی پٹیل کے حکم کے تحت اس کے آس پاس اونچی دیواریں چُن دی گئی تھیں۔ اسی کنوئیں سے ملا ہوا ایک وکیل قاضی ظہیر الدین کا مکان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ظہیر الدین نے اپنے مکان کے سامنے کی میونسپلٹی کی زمین ہتھیالی ہے اور پیپل کے درخت کے آس پاس جو تین دوکانیں ہیں اس پر بھی ان کی نظر تھی۔ یہ دوکانیں دراصل ایک ٹرسٹ کی ہیں جس کی کوئی دستاویز تو موجود نہیں لیکن برسوں سے یہ روایت چلی آرہی ہے اور اس ٹرسٹ کی آمدنی سے ایک پیاؤ چلایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اصرار پر ہی اس پیاؤ کو ایک ہندو چلاتا ہے اس لیے کہ آس پاس زیادہ تر ہندوؤں کی دوکانیں ہیں۔

دراصل یہ جھگڑا جگہ کے متعلق ٹرسٹ اور قاضی ظہیر الدین کے درمیان تھا۔ کسی کمیونٹی اور فرقے سے اس کا قطعاً کوئی تعلق نہ تھا لیکن چند ہندو فرقہ پرستوں نے جلد ہی اسے فرقہ واریت کی صورت دیدی۔ ان کی طرف یہ کہا جانے لگا کہ یہاں ایک مندر تھا۔ دراصل عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ یہاں کبھی کوئی مندر نہیں رہا۔ دراصل پیپل کے درخت کا فائدہ اٹھا کر یہ بات کہی جانے لگی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مندر پہلی منزل کی سطح پر بتایا جاتا ہے جہاں ایک چھجا بنا ہوا ہے (بھلا مندر کی خاطر اپنی دوکان کی جگہ کون دے گا) پروفیسر ہرپال سنگھ جو شہر میں ایک کالج میں شعبۂ سیاسیات کے صدر ہیں مجھے بتایا کہ شیولنگ ہمیشہ پیڑ کے تنے کے قریب نیچے ہوتا ہے، پہلی منزل

کی سطح پر ہرگز نہیں ہوسکتا۔

جب مندر کا دعویٰ کیا جانے لگا تو قاضی ظہیرالدین نے بھی وہی داؤں پیچ اپناتے ہوئے اس کے قریب ایک مزار کا شوشہ چھوڑ دیا۔ اور یہاں بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں مزار بتایا جاتا ہے وہاں ظہیرالدین صاحب نے پاخانہ بنا رکھا ہے۔ بہرحال فرقہ پرستوں کو کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیئے۔ فرقہ پرستوں نے اب معاملے میں گرمی پیدا کرنے کے لیے جہاں مندر بتایا جاتا ہے وہاں ایک گھنٹہ ٹانگ دیا گھنٹہ ٹانگنے میں میرٹھ شہر کے اس وقت کے ایس پی مسٹر راوت نے ہندو فرقہ پرستوں کی خاص مدد کی۔ یہ گھنٹہ مارچ ۱۹۸۲ء میں ٹانگا گیا۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ میرٹھ شہر کے بعض ضلع حکام کھلم کھلا آر ایس ایس سے اپنی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں میرٹھ شہر کے موجودہ ایس پی پیارے لال اور ڈی ایم راج کشور مشرا خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ جنوری ۱۹۸۲ء میں جب بالا صاحب دیورس میرٹھ آئے تو ان دونوں افسروں نے باقاعدہ اپنی وردی میں ان کو لوگوں کے درمیان سیلوٹ کیا تھا۔ ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ بالا صاحب دیورس آر۔ ایس۔ ایس کے چیف جہاں بھی جاتے ہیں چند مہینوں کے اندر اندر وہاں فرقہ وارانہ فساد ضرور ہوتا ہے۔ میرٹھ میں بھی یہی ہوا۔

بہرحال پولیس افسر کی مدد سے گھنٹہ ٹانگا گیا اور اب وہاں باقاعدہ روزانہ شام کو آرتی ہونے لگی۔

جب فرقہ وارانہ تناؤ بڑھنے لگا تو حکام نے تحقیقات کرانے کا فیصلہ کیا کہ یہاں مندر یا مزار تھا یا نہیں۔ اس دوران دونوں فرقے کے نمائندے اس بات پر رضامند ہو گئے کہ تحقیقات مکمل ہونے تک وہ کوئی ایسی بات نہ کہیں گے یا نہیں کریں گے جس سے حالات اثر انداز ہوں۔ تحقیقات ۲۰ اگست کو مکمل ہو کر نتیجے کا اعلان ہونا تھا۔ ۱۲ اگست کو جنم اشٹمی کا تہوار تھا ۱۳ اگست کی رات کو جن سنگھ کے سابق ایم۔ ایل۔ اے مسٹر کپور اپنے ساتھیوں کی بڑی تعداد کو لیکر نزاعی مندر پر پوجا کرنے پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے دفعہ ۱۴۴ کی بھی پرواہ نہیں کی جو اس علاقے میں نافذ تھا۔ پولیس نے اطلاع ملتے ہی جگہ پر پہنچ کر ۲۳ آدمیوں کو گرفتار کر لیا لیکن سیاست دانوں کے دباؤ میں آ کر جن میں شہر کانگریس آئی کے صدر دواکر بھی شامل ہیں

پولیس نے انھیں رہا کر دیا۔ اس سے ہندو فرقہ پرستوں کو اور شہ مل گئی۔ ادھر ردِ عمل کے طور پر کچھ مسلم انتہا پسندوں نے بھی مزار کے مسئلے کو اور زیادہ اہمیت دینا شروع کر دیا۔

مجسٹریٹ جس نے تحقیقات کی تھی اپنا فیصلہ ۲۰ اگست کو سنانے والا تھا لیکن دباؤ کے تحت فیصلے کا اعلان ملتوی کر دیا گیا۔ اُسی دن شام میرٹھ کے کچھ اہم شہری جمع ہوئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک سمجھوتا ہو گیا جس پر دو ہندوؤں اور دو مسلمانوں نے دستخط کیے۔ اس سمجھوتہ کے مطابق نہ نام نہاد مندر میں گھنٹے کا استعمال کیا جائے گا اور نہ ہی اسی طرح نام نہاد مزار کے وجود پر زور دیا جائے گا۔ لیکن کچھ اہم مسلم شہری جو اس سمجھوتے پر دستخط کرنے میں شامل نہیں کیے گئے تھے، اسے اپنی توہین تصور کیا اور حکیم سیف الدین نے مزار پر چادر چڑھانے کا اعلان کر دیا اور اس کے لیے چندہ جمع کرنا بھی شروع کر دیا۔

صورتِ حال کو نازک دیکھ کر حکّام نے مندر، مزار والی جگہ کو سیل کر دیا۔ اب ہندو فرقہ پرستوں نے اُسے توہین سمجھ کر شہر میں ہڑتال کرا دی جو تین دن تک جاری رہی۔ دوسری طرف میرٹھ بار ایسوسی ایشن نے سیل کرنے کے خلاف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں اپیل دائر کر دی اور ۲۲ ستمبر کو عدالت نے سیل کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ بی جے پی کے لیڈر موہن لال کپور نے اس پر فتح کا جلوس نکالا اور ان کے ساتھیوں نے ان کا ہیرو کی طرح استقبال کرتے ہوئے انھیں خوب پھول مالائیں پہنائیں۔ یہ جلوس ۲۳ ستمبر کو نکالا گیا۔

ادھر ۲۸ ستمبر کو عید الاضحیٰ کا تہوار تھا۔ شہر قاضی زین العابدین نے کچھ مسلمانوں سے مشورہ کر کے احتجاج کے طور پر عید گاہ میں نماز پڑھنے کا اعلان کر دیا اور مسلمانوں سے کالی پٹی پہننے کی اپیل کی۔ اس سے شہر میں تناؤ میں اضافہ ہو گیا۔ چند مسلمانوں نے اپنے گھروں پر سیاہ جھنڈے لگائے جس کے جواب میں ہزاروں ہندوؤں نے اپنے گھروں پر بھگوے اور لال جھنڈے لہرائے اور ان پر پی اے سی کی تعریف لکھی گئی اور اُسے ہندوؤں کا محافظ بتایا گیا۔ اس بات سے بھی ہمیں پی اے سی کے رول کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسی دوران چھُرے بازی کے چھٹ پٹ واقعات ہو رہے تھے۔ اگست کے آخری ہفتے میں ایک مسجد کے پیش امام کو چھرا مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ جس کے جواب میں ۶ ستمبر کو متنازعہ مندر کے پجاری رام بھولا کو

قتل کر دیا گیا۔ رام بھولا ایک معطل شدہ چپڑاسی تھا۔ اور اپنے علاقے کا غنڈہ بھی۔ اسی طرح ۸ ستمبر کو ایک مسلم ہوم گارڈ شبیر کو جب وہ ڈیوٹی پر جا رہا تھا چھرا مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اسی دن ایک دوسرے پیش امام کو بھی جن کی عمر ۷۰ سال تھی اور شہاب الدین نام تھا چھوٹی مسجد کشن پاڑہ میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

۲۸ ستمبر کو جھنڈوں کی جنگ نے میرٹھ کی فرقہ وارانہ فضا کو غیر معمولی حد تک متأثر کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پہلے سے تیاریاں ہو رہی تھیں اور کسی موقع کا انتظار تھا۔ ۳۰ ستمبر سے ۲ اکتوبر تک میرٹھ میں مسلمانوں پر قیامت گذر گئی۔ چند شر پسند عناصر اور پی اے سی نے مل کر بے گناہوں کا قتل عام اور ان کے گھروں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ یہ سب کیسے ہوا قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ ایسا لگتا ہے (یہ میں میرٹھ میں کئی غیر جانبدار ہندوؤں سے پوچھ تاچھ کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں) کہ اس قتل عام کی ایک خاص حکمت عملی تیار کی گئی تھی چند شر پسند عناصر بلڈنگ کی چھت سے بم پھینکتے تھے یا گولی چلاتے تھے اور پی اے سی کے جوان اُسے بہانہ بنا کر اقلیتوں کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار شروع کر دیتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق صرف ایک اکتوبر کی رات کو پی اے سی کی گولیوں سے ۶ مختلف علاقوں میں کم از کم ۱۰۰ لوگ مارے گئے۔ اور مرنے والوں میں زیادہ تعداد ۱۲ سے ۲۵ سال عمر والوں کی ہے۔ ایسا لگتا ہے نوجوانوں کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا۔ عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ پی اے سی پر اُس رات خون سوار تھا۔ جو لوگ اپنی جان بچانے کے لیے دروازے بھیڑ کر گھروں میں گھس گئے تھے۔ پی اے۔ سی کے نوجوانوں نے دروازے توڑ کر اُنھیں باہر گھسیٹا اور گولی مار دی۔

یہ قتل عام بھومیا کے پل کے قریب سب سے بھیانک تھا۔ مسٹر ظفر علی جونیر انجینیر کو جو ہوری نگر گھر نمبر ۳۰۴ سی میں رہتے تھے باہر نکال کر گولی مار دی اور ان کے پانچ بچوں کے ساتھ پی اے سی کے نوجوانوں نے ظالمانہ سلوک کیا۔ اسی گھر کے پاس شیر دین کی بیوہ نے مجھے رو رو کر بتایا کہ کس طرح پی۔ اے۔ سی کے درندوں نے اس کے شوہر کو جسے اندر کے کمرے میں چھپا رکھا تھا پی۔ اے۔ سی نے گھسیٹ کر باہر نکالا اور گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس بیوہ جس کا نام رئیسہ بانو ہے، بچے ہیں جن کا نگہبان اب کوئی نہیں رہا۔ اس کے پاس والے مکان میں انور کو

جس کی عمر ۲۶ سال تھی گولی ماردی گئی۔ شیرو جمال عمر ۴۰ سال، ضیاء الرشید اور اس کے والد یوسف میاں عمر ۸۰ سال (جو مریض تھا اور صاحب فراش محلہ الٰہی بخش میں ان سب کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ اسی علاقے میں گلی سینی والی میں عزیز عمر ۵۴ سال، پھول سنگھ گھسیٹا (عمر کا پتہ نہیں)، بندو عمر ۵۴ سال، زینب چھوٹو کی بہو عمر ۴۰ سال کو گولی ماردی گئی اور شبنم کو جس کی عمر ۸ سال ہے چھرے سے کئی زخم لگائے گئے (لیکن جو خوش قسمتی سے بچ گئی۔

سب سے زیادہ بھیانک وارداتیں اسی علاقے میں فیروز بلڈنگ میں ہوئی۔ نام سے ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی بڑی بلڈنگ ہوگی۔ دراصل یہ نیم پختہ مکانوں کی ایک قطار کا نام ہے جس میں محنت مزدوری کرنے والے غریب مسلمان رہتے ہیں۔ اس بلڈنگ کے مہلوکین کے کچھ نام یہ ہیں بابو عمر ۲۵ سال، شمشاد عمر ۲۶ سال (یہ باپ بیٹے تھے)، شہادت علی عمر ۲۵ سال، قیوم عمر ۵۵ سال (ان کا لڑکا جو میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے بری طرح زخمی ہوا ہے)، مسرت علی عمر ۲۴ سال، پرویز عالم عمر ۱۲ سال (یہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا جو بڑی منتوں کے بعد ۶ لڑکیوں پر پیدا ہوا تھا)۔ فیروز بلڈنگ میں سب سے المناک واقعہ ڈاکٹر شبیر حسین کے ساتھ پیش آیا۔ ان کا بیٹا اقبال عمر ۱۲ سال ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب پی اے سی نے اسے گولی کا نشانہ بنانا چاہا تو ماں اور باپ دونوں سامنے آگئے اور کہنے لگے اسے چھوڑ دو اور ہمیں گولی ماردو۔ یہ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔ پی اے سی نے انھیں دھکیل کر ایک طرف کردیا اقبال کو ان کے سامنے گولی ماردی۔ نہ صرف یہ بلکہ شبیر حسین سے اپنے جوان بیٹے کی لاش اٹھوائی اور خون صاف کروایا۔ ڈاکٹر شبیر حسین کو بالائے ستم یہ کہ گرفتار کرلیا اور آج بھی حوالات میں بند ہے۔ اس پر پولیس پر حملہ کرنے کا الزام ہے۔ اس کے گھر کی ہر چیز لوٹ لی گئی۔ میں جب ۲۶ اکتوبر یعنی تقریباً اس واقعے کے ایک مہینے بعد ان کے گھر گیا تب بھی ہر چیز بکھری ہوئی پڑی تھی اور زبانِ حال اپنی داستان سنا رہی تھی۔

ان کے علاوہ فیروز بلڈنگ اور اس کے آس پاس جو مارے گئے اُن کے نام ہیں ثریا عمر ۷ برس، دو سگے بھائی خلیل اور سلیم عمر ۱۷ اور ۱۸ برس، کلوا ولد نصیر الدین عمر ۲۰ سال، مینو ولد فہیم الدین عمر ۱۷ سال، ارشاد ولد حمید عمر ۱۸ سال۔ جیسا کہ عرض کیا گیا اس دن کم سے کم

۱۰۰ افراد پی اے سی کی گولیوں کا نشانہ بنے اور تقریباً ۴۰۰ گھر بے دردی سے لوٹے گئے۔ پوروا فیاض علی گلی پھیران میں دو لڑکے یمین اور یسین دو اکتوبر کو مارے گئے اور یہاں ۳۶ گھروں کو لوٹا اور ۳۸ افراد کو گرفتار کیا گیا۔ اسی طرح محلہ ماہی گیران میں ماسٹر امیر احمد عمر ۶۰ سال کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔

یہ خونی داستان بڑی طویل ہے جسے لکھتے ہوئے قلم خون کے آنسو روتا ہے اور ہاتھ لرزنے لگتے ہیں۔ واقعات بہت ہیں کوئی کہاں تک لکھے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ خون کی پیاسی پی اے سی کا کوئی کچھ نہیں کرتا۔ انھیں سخت سے سخت سزا دینا تو دور رہا اس فورس کو یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہر فرقہ وارانہ فساد کے موقع پر بلایا جاتا ہے۔ مراد آباد کے خونیں واقعات کے بعد حکومت نے یقین دلایا تھا کہ اب مسلم دشمن پی اے سی کو ایسے موقع پر استعمال نہیں کیا جائے گا۔ ایسی ہی یقین دہانی بہار شریف کے فرقہ وارانہ فساد کے بعد بھی کی گئی تھی۔ آخر کیوں اس مسلم دشمن طاقت کو ہر بار بلایا جاتا ہے۔ اس کا ذمے دار کون ہے؟ کیا حکومت جواب دے گی؟ اسی طرح پیارے لال جیسے سخت متعصب پولیس افسر کا آج تک میرٹھ سے تبادلہ نہیں ہو سکا اور یہ اندرا گاندھی کی ہدایات کے باوجود؟ اس کا تبادلہ نہ ہونے پر خود وزیر اعظم کو تعجب ہوا اور اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ آج بھی ان کا تبادلہ نہیں ہوا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ میرٹھ میں پروفیسر ہرپال سنگھ اور مسز ہرپال سنگھ جیسے انسان دوست لوگ موجود ہیں اور ایڈوکیٹ برج راج کشور جیسے انصاف پسند انسان بھی۔ اول الذکر میاں بیوی میرٹھ کے ایک کالج میں پڑھاتے ہیں اور برج راج کشور میرٹھ سی پی آئی کے سکریٹری ہیں۔ ان کے انسان دوست دلوں میں میں نے اقلیت کے لیے سچی ہمدردی کے جذبات موجزن دیکھے۔ پروفیسر ہرپال سنگھ منظور احمد ایم ایل اے کے ساتھ رات دن فساد کے شکار افراد کی ہر طرح سے مدد کرنے پر لگے ہوئے ہیں۔ یہ ان افراد کی مالی امداد بھی کرتے ہیں اور ان کو دلاسہ دیکر اپنے اُجڑے ہوئے گھروں میں دوبارہ آباد بھی کراتے ہیں ایسے ہی افراد فرقہ واریت کے گھور اندھیروں میں اُمید کے چراغ جلاتے ہیں۔

نومبر ۱۹۸۲ء

بڑودہ کا فرقہ وارانہ فساد

یا مسلمانوں پر ایس آر پی کا ظلم؟

ابھی میرٹھ کے فساد کی رپورٹ مکمل نہیں کر پایا تھا کہ اخباروں میں بڑودہ میں فساد پھوٹ پڑنے کی خبریں شائع ہونے لگیں۔ آج اس عظیم ملک کی یہی بدقسمتی ہے۔ سرکاری آنکڑوں کے مطابق پچھلے ستمبر سے اس سال اگست تک ۳۵۹ فسادات ہو چکے ہیں جن میں ۵۲۳ جانیں تلف ہوئیں اور کروڑوں کی ملکیت تباہ و برباد۔ ۱۹۶۹ء کے بعد سب سے زیادہ جانیں ۱۹۸۱ء میں ضائع ہوئی ہیں۔ اور پھر یہ تو سرکاری اعداد و شمار ہیں۔ حقیقت میں کتنے لوگ مارے گئے یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک سال میں ۳۵۹ فسادات کے معنی ہیں ایک دن میں ایک فساد۔ ہمارے گنگا جمنی تہذیب والے ملک اور ایسا ملک جہاں باشندے اپنی قوت برداشت پر فخر کرتے ہیں، اس کے لیے یہ کتنی شرم کی بات ہے۔

قوتِ برداشت وہیں تک کام کرتی ہے جب تک آسودگی ہو اور سماج کے ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہوں۔ اگر ذرائع معاش پر چند لوگ، ایک طبقے کے لوگ یا ایک فرقے میں ایک طبقے کے لوگ اپنا اجارہ قائم کر لیں تو قوتِ برداشت ایک طرف دھری رہ جاتی ہے اور لوگ آپس میں قتل و غارت گری شروع کر دیتے ہیں۔ یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کمزور اقلیتیں (طاقتور اقلیتیں بھی ہوتی ہیں جو پوری قومی زندگی پر چھا جاتی ہیں جیسے کہ امریکہ میں یہودی) اکثریتی فرقے کے مقابلے میں معاشی وسائل سے مقابلتہً زیادہ ہی محروم رہ جاتی ہیں اور اکثریتی فرقے کے بالائی طبقے انھیں مادی وسائل سے محروم رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ان

فرقہ وارانہ فسادات کے پیچھے سیاسی اور معاشی عوامل کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بڑودہ فساد ایک حد تک نرالا کردار رکھتا ہے۔ اس کے پیچھے بھی سیاسی اور معاشی عوامل ضرور ہیں لیکن کسی اور صورت میں جس پر ہم روشنی ڈالیں گے۔ ان عوامل کو سمجھے بغیر ہم اس فساد کی اصل حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ شروع میں ہی یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بڑودہ کا فساد روایتی معنوں میں فرقہ وارانہ فساد نہیں ہے۔ اس کے پیچھے نہ بی جے پی والے تھے نہ آر ایس ایس والے۔ اس میں نہ کوئی سیاسی مسئلہ براہ راست شامل تھا نہ مذہبی مسئلہ۔ فساد محرّم کے موقع پر ہوا ضرور لیکن اس میں تعزیئے اٹھانے یا جلوس کے راستے کا بھی کوئی سوال درمیان میں نہیں تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر پھر فساد کس سوال پر ہوا؟ اس پر ہم بہت جلد روشنی ڈالیں گے۔

بڑودہ شہر کی کل آبادی ساڑھے سات لاکھ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۸۵ ہزار یا کُل آبادی کی ۱۲ فیصد ہے۔ مسلمانوں کے یہاں ۶ بڑے فرقے ہیں: (۱) علوی بوہرے، تعداد ۷ ہزار، (۲) سلیمانی بوہرے تعداد دو ہزار (۳) داؤدی بوہرے تعداد ۱۲ سو، (۴) دودھ والی جماعت، (۵) میمن اور (۶) دوسرے مسلمان۔ مسلمانوں میں یہاں سب سے زیادہ خوشحال علوی بوہرے اور دودھ والی جماعت کے مسلمان ہیں۔ علوی بوہروں کے ہاتھ میں تجارت ہے (یہ بوہروں کے سندھی کہلاتے ہیں) اور دودھ والی جماعت کے مسلمانوں کے ہاتھ میں ٹرانسپورٹ۔ سلیمانی بوہروں کا تعلق متوسط طبقے سے ہے اور یہ دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ تعلیمیافتہ ہیں۔ داؤدی بوہروں اور دوسرے مسلمانوں میں بے حد غربت ہے۔ بڑودہ کا مسلمان تقریباً ۸۵ فیصد سے زیادہ غریبی خط سے نیچے ہیں۔ غربت اور افلاس میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت احمد آباد کے مسلمانوں سے بھی زیادہ خراب ہے۔ تعلیم کے میدان میں بھی کتنے پچھڑے ہوئے ہیں اس کا اندازہ ان اعداد سے ہو سکتا ہے جو مسلم ایجوکیشن سوسائٹی نے جمع کیے ہیں۔ نریاڈ ایس ایس سی بورڈ میں مسلم لڑکیاں دوسری غیر مسلم لڑکیوں کے مقابلے میں ایک اور گیارہ کے تناسب میں ہیں۔

پچھلے چند دہوں میں بڑودہ میں سب سے بڑا فساد احمد آباد فساد کے ساتھ ساتھ سنہ ۱۹۶۹ء میں ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۸۱ء میں ہوا اور پھر ۴۱۰ دن کے بعد ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۲ء کے دن۔ ۱۹۶۹ء میں جو فساد ہوا وہ صحیح معنی میں فرقہ وارانہ فساد تھا جس میں آر ایس ایس، جن سنگھ

اور اُن کے حامی بڑی تعداد میں شریک تھے اور اُن کا تعلق زیادہ تر اونچی ذات کے ہندوؤں سے تھا۔ لیکن ۱۳ ستمبر ۱۹۸۱ء اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۲ء والے فسادات میں نہ بی جے پی، آر ایس ایس کا ہاتھ تھا نہ اونچی ذات کے ہندوؤں کا۔ ان دونوں فسادات میں بڑودہ کی شیڈولڈ کاسٹ سے تعلق رکھنے والی دو ذاتوں یعنی کہار (یا بھوئی) اور رانا نام کی ذاتوں کا ہاتھ تھا۔ بڑودہ میں ۲۵ فی صد آبادی مرہٹوں کی ہے کیونکہ بڑودہ کا تعلق گائیکواڑ خاندان کے مرہٹہ حکمرانوں سے تھا۔ مرہٹوں کی عام طور پر معاشی حالت مسلمانوں کی طرح خراب ہے۔ کہار یا بھوئی پچھڑے ہیں۔ اور مرہٹوں میں سب سے نیچی ذات کے سمجھے جاتے ہیں۔ بڑودہ کے کچھ علاقوں میں کہار اور مسلمان ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔

مسلمان اور کہار (یا بھوئی) غربت کی وجہ سے اکثر غیر قانونی شراب کی کشید اور فروخت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء تک اس پیشے کی اجارہ داری کچھ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی لیکن اس کے بعد سے یہ اجارہ داری ان کے ہاتھ سے نکل کر کہاروں کے ہاتھ آگئی ہے۔ اور یہی سارے فساد کی جڑ بنی ہوئی ہے۔ ستمبر ۱۹۸۱ء کے فساد میں بھی یہی دشمنی کام کر رہی تھی۔ خیر اُس فساد کی تفصیل میں ہم یہاں نہیں جانا چاہتے۔ کہاروں میں آج شیوا کہار نام کا ایک آدمی غیر قانونی شراب کی کشید و فروخت کا سب سے بڑا مالک ہے۔ اس کے پولیس افسروں اور سیاسی کارکنوں سے گہرے مراسم ہیں۔ چند مہینوں پہلے بڑودہ میں ایک سیمینار میں چند کانگریس آئی کے کارکنوں نے کھلے عام یہ الزام لگایا تھا کہ بڑودہ میں روزانہ ایک لاکھ کی شراب فروخت ہوتی ہے اور ہر سال ۶۰ لاکھ روپے کا ہفتہ پولیس افسروں اور منسٹروں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس الزام کی کسی حلقے سے آج تک تردید نہیں کی گئی۔

اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ شیوا کہار کے پولیس افسروں سے کتنے قریبی تعلقات ہیں۔ تحقیقات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جو پولیس افسر شیوا کہار سے جتنا قریب ہے وہ اتنا ہی زیادہ "کمیونل" ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شیوا کہار کو اپنے مسلم حریفوں سے سخت دشمنی ہے۔ اتنا ہی نہیں ایک مسلم سماجی کارکن نے اس کے خلاف اعلیٰ حکام سے شکایت بھی کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مئی ۱۹۸۱ء میں شیوا کہار کو پولیس کو گرفتار کرنا پڑا تھا۔ لیکن جیل میں اسے ہر طرح کی

سہولت مہیا کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اُسے روزانہ شراب بھی سپلائی کی جاتی تھی۔ اس کی شکایت ایک مسلم سماجی کارکن عالم شاہ دیوان نے پولیس کے اعلیٰ افسروں سے کی اور مجبوراً بڑودہ کے پولیس افسروں کو یہ سب کچھ بند کرنا پڑا۔ شیوا کہار تب سے مسلمانوں پر خار کھائے بیٹھا ہے اور موقع کی تلاش میں ہی رہتا ہے۔ اس لیے جتنے پولیس افسر اس کے قریب ہیں اور اس سے ہفتہ وصول کرتے ہیں، وہ بھی مسلمانوں سے اتنی ہی نفرت کرتے ہیں اور انھیں "مزہ چکھانے" کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔

ہمیں بتایا گیا کہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو بڑودہ میں نواپورہ کے علاقے میں چاقوزنی کے ایک واقعے کے بعد فساد پھوٹ پڑا۔ اس لیے مسلمانوں نے طے کیا کہ وہ اس سال تعزیئے نہیں بٹھائیں گے لیکن گجرات کے وزیر داخلہ پربودھ راول نے مسلمانوں سے اصرار کیا کہ وہ تعزیئے بٹھائیں اور اُنھیں یقین دلایا کہ اُن کی ہر طرح سے حفاظت کی جائے گی مسلمان اس بات پر راضی ہوگئے اور ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو وہ تعزیئے بٹھانے باہر نکلے۔ فساد کی وجہ سے اس علاقے میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ مسلمان جیسے ہی تعزیئے بٹھانے باہر نکلے پولیس ان پر ٹوٹ پڑی، اُنہیں خوب زدوکوب کیا۔ ۲۲ آدمی پولیس کی گولیوں سے زخمی ہوئے اور ۷۰ آدمیوں کو گرفتار کیا گیا جس میں ۹ ہندو اور باقی مسلمان تھے۔ ۵۶ مسلمانوں پر دفعہ ۳۶۰ لگائی گئی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وزیر داخلہ راول نے پولیس کو ٹھیک سے ہدایت نہیں دی تھی کہ وہ انھیں تعزیئے رکھنے دے اگر نہیں تو مسلمانوں کو یقین دہانی کے کیا معنیٰ تھے؟ اور اگر ہدایت کی تھی تو کیا پولیس وزیر داخلہ کا حکم نہیں مانتی یا وہ کسی اور کا حکم مانتی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ پولیس کے مقامی افسر شیوا کہار سے ساز باز کیے ہوئے تھے۔

یہاں ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ بڑودہ کی شہر کانگریس آئی گروہ بندی کا شکار ہے اور آئے دن آپس میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ سُنت مہتا اور اشوک بھوگی لال پٹیل کے گروہوں میں آپس میں سخت ٹکراؤ ہے۔ اشوک پٹیل کا گروہ چیف منسٹر کا حامی گروہ سمجھا جاتا ہے۔ بڑودہ کے ڈپٹی میئر سید نثار بابو نے بتایا کہ مسٹر پٹیل کے یہاں کشن ٹھاکر نام کا ایک آدمی کام کرتا ہے اور یہ شیوا کہار کے بالکل قریب ہے بلکہ کہا جاتا

ہے کہ شیوا کہار کے آدمی اکثر اشوک بھوگی لال پٹیل کے یہاں جمع ہوتے ہیں اور پولیس اور منسٹروں کے "تحفتے" کی رقم بھی یہیں طے پاتی ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ حکمراں جماعت کا ایک گروہ بھی شیوا کہار کا سرپرست ہے اور پولیس افسر بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور یہ گروہ وزیر اعلیٰ سے قریب بھی ہے۔ بڑودہ کا مقامی پریس بھی یہی رپورٹنگ کرتا رہا ہے کہ ان فسادات کی ایک وجہ حکمراں کانگریس آئی کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست ہے۔

۲۳ اکتوبر سے ۲۷ اکتوبر تک پتھراؤ اور چاقوزنی کے واقعات بڑودہ کے کچھ علاقوں میں ہوتے رہے۔ ۲۷ اکتوبر کو مسلمانوں نے تعزیوں کا جلوس نکالا (حالانکہ کچھ سنجیدہ مسلم دانشور اور لیڈر جیسے کہ جوذر بندوق والا وغیرہ تعزیئے اٹھانے کے حق میں نہیں تھے)۔ جلوس جب لال اکھاڑہ سے گذر رہا تھا۔ جو مرہٹوں کا علاقہ ہے۔ دو مسلم لاشیں برآمد ہوئیں۔ اس سے کشیدگی میں اضافہ ہوگیا۔ حالات پیچیدہ ہوتے گئے اور ۲۹ اکتوبر کو ایک ہندو کو قتل کر دیا گیا۔ یہ قتل مغل واڑہ علاقے میں نعل بندواڑہ میں ہوا اور اس واقعے سے شیوا کہار اور پولیس کو وہ موقع مل گیا وہ جس کی تلاش میں تھے۔ اس قتل کو بہانہ بنا کر ایک طرف پولیس (ایس آر پی کے ساتھ) مسلم علاقوں میں گھس گئی اور مسلمانوں کو خوب زدوکوب کیا اور دوسری طرف شیوا کہار اور اس کے ساتھیوں نے مسلمانوں کے جھونپڑے اور مکان زمین دوز کر دیئے۔ شیوا کہار کے ساتھیوں نے پانی پل کے قریب قبرستان کی ۳۰۰ فٹ دیوار کو مسمار کر دیا اور قبریں بھی توڑ دیں۔ یہ سب کچھ کہار اور پولیس نے مل جل کر کیا۔ پولیس کے مظالم کی داستان رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے۔ گھروں میں گھس کر مسلمانوں کو بڑی بے رحمی سے مارا۔ نشانہ خاص طور سے محنت مزدوری کرنے والے مرد تھے۔ اکثر رکشہ چلانے والے مردوں کی کہنیاں اور گھوٹن توڑ دیئے اور ان میں سے اکثر مفلوج ہو چکے ہیں بعض لوگوں نے عجیب داستان سنائی۔ ہم سے یہ کہا گیا کہ پولیس مردوں کو باہر بلاتی اور یہ کہنی کہ ڈی۔ ایس۔ پی صاحب کو بتاؤ تم نماز کیسے پڑھتے ہو۔ جب وہ شخص نماز پڑھ کر دکھاتا اور سجدے میں جاتا تو دو ایس آر پی کے جوان اپنے بوٹ سے ان کے ہاتھ کچل دیتے، تیسرا اُن کی گردن پر بوٹ رکھ کر دباتا اور چوتھا اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برساتا۔ ان میں سے

کئی شاید زندگی بھر مفلوج ہی رہیں۔ ان کے گھروں کو بھی لوٹ لیا گیا اور کئی گھروں میں آگ لگادی گئی۔ یہ سب اس طرح منصوبہ بند طریقے سے کیا گیا کہ ہندوؤں کے گھروں کو آنچ تک نہیں آئی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض اونچی ذات کے ہندوؤں مثلاً پٹیل ڈیسائی وغیرہ نے مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی اور بار بار پولیس کو ٹیلیفون کئے۔ ہم سے کہا گیا کہ تھوڑی دیر بعد ان کے ٹیلیفون کاٹ دیئے گئے اور بجلی کا کنکشن بھی۔ اس فساد سے پہلے بڑودہ میں ۷ مسلم PSI (POLICE SUB INSPECTOR) تعینات تھے۔ ان کا فساد سے کچھ پہلے ستمبر میں تبادلہ کر دیا گیا۔

۲۸ اکتوبر کو فوج کو بلایا گیا لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ فوج محض تماشائی تھی اور مقامی پولیس کے ہاتھ میں سارے اختیارات تھے۔ مسلمانوں کی شکایت یہ ہے کہ کہاروں کے ہاتھ چھرے بازی کے واقعات میں پانچ مسلمان مارے گئے تو پولیس نے کسی کو گرفتار نہیں کیا لیکن کسی مسلمان کے ہاتھوں جب ایک کہار مارا گیا تو پولیس اور ایس آر پی نے مل کر مسلمانوں پر اتنا ظلم کیا اور سینکڑوں مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔ شیوا کہار کے آدمیوں نے جب مسلم گھروں پر حملے کیے اور جب وہ رپورٹ لکھوانے پولیس تھانے گئے تو پولیس نے اُلٹا اُنھیں ہی گرفتار کر لیا۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور چیف منسٹر بڑودہ کے دورے پر بھی نہیں گئے جو احمد آباد سے صرف ۱۶۰ کلومیٹر ہے۔ جب وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ۳ نومبر کو دہلی میں انڈین یونین مسلم لیگ کا ایک وفد ملا اور یہ پوری داستان سنائی تو مسز اندرا گاندھی نے گجرات کے وزیر اعلیٰ سے بڑودہ کا دورہ کرکے رپورٹ پیش کرنے کے لیے کہا تب وزیر اعلیٰ نے ۶ نومبر کو بڑودہ کا دورہ کیا۔

بڑودہ شہر سے نہ کوئی مسلمان ایم ایل اے ہے نہ ایم پی ۔ ۶۰ میونسپل کونسلر میں سے ۷ مسلم ہیں (۶ حکمراں کانگریس پارٹی کے اور ایک آزاد) مسلم رائے عامہ کے دباؤ سے مجبور ہو کر پانچ مسلم کونسلرز نے اپنا استعفےٰ پیش کر دیا ہے۔ حکمراں پارٹی کی طرف سے ان پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اپنا استعفےٰ واپس لے لیں اور انہیں یقین دلایا جا رہا ہے کہ

ان پولیس افسروں کا تبادلہ کر دیا جائے گا جنہوں نے مسلمانوں پر زیادتیاں کی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ۶ کونسلرز استعفے واپس لے لیں گے۔ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔

بڑودہ فسادات کے سلسلے میں ایک بات صاف ہے کہ اسے فرقہ وارانہ فساد روایتی معنی میں کہنا غلط ہوگا۔ اس کے پیچھے کوئی سیاسی مقصد بھی نہیں ہے۔ اس فساد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید ہندوستان میں بدعنوانی اور رشوت خوری کا رول بڑھتا جا رہا ہے۔ بے ضمیر سیاست داں اپنے ذاتی مفادات کے لیے شیوا کہار جیسے غنڈوں کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ غنڈوں کو سیاسی سرپرستی چاہیئے اور سیاست دانوں کو غنڈوں کا پیسہ چاہیئے۔ اور ان کی جسمانی طاقت بھی۔ یہ رجحان بڑا خطرناک ہے اور تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے اور اس کے لیے حکمراں پارٹی سب سے زیادہ ذمّے دار ہے۔ پی اے سی، ایس آر پی جیسی مسلح پولیس تنظیمیں پہلے سے ہی اینٹی مسلم ہیں اور اگر ان کو شیوا کہار جیسے غنڈوں کا بھی سہارا مل جائے تو یہ اقلیتوں پر کیا ظلم ڈھا سکتے ہیں اس کا صحیح اندازہ بڑودہ جا کر ہی ہو سکتا ہے۔

ان فسادات میں ۷ جانیں تلف ہوئیں، ۵۵ مجروح ہوئے اور ۶۲۲ گرفتار۔ مرنے والوں میں ۶ مسلمان ہیں اور گرفتار ہونے والوں ۵۰۴۔

نومبر ۱۹۸۲ء

آسام تحریک

تحقیقی رپورٹ اور تجزیہ

نیلی میں بنگلہ دیشی مسلمانوں کے قتل عام نے ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔ اس رائے سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ تقسیمِ وطن کے بعد اتنے بڑے پیمانے پر ہندوستان میں کبھی قتل عام نہیں ہوا۔ نیلی نے ہم سب کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھدیا۔ نیلی کے قتل عام اور مقتول کی تصاویر نے مجھے بھی اس بات پر بے چین کردیا کہ میں بذاتِ خود آسام جاکر معاملہ کی تحقیقات کروں اور صحیح واقعات کی کھوج لگاکر ملک کے عوام کے سامنے ایمانداری سے پیش کروں۔ چنانچہ میں ۷ ارمارچ کو آسام کے لیے روانہ ہوا اور ایک ہفتہ قیام کرکے کئی واقعات کی چھان بین کی۔

دراصل آج آسام میں جو کچھ ہورہا ہے اُسے سمجھنے کے لیے آسو (AASU) کی تحریک کو بنیادی طور پر سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ نیلی جیسے واقعات کو ہم آسو تحریک کی روشنی میں ہی معروضی طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ہندوستان کا مسلمان عام طور پر آسو تحریک کو مسلم مخالف تحریک سمجھتا ہے اور یہ تاثر لیے رہتا ہے کہ یہ آسام سے مسلمان شہریوں کو نکال باہر کرنے کی ایک سازش ہے۔ اور آسو، آر ایس ایس سے ملکر یہ سازش کررہی ہے۔ میں بھی کم وبیش یہی تاثر لیکر آسام گیا تھا۔ لیکن حقیقت اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ آسو کی تحریک کو سمجھنے کے لیے آسام کی صورت حال کی تمام تر پیچیدگیوں کو مدِ نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔

سب سے پہلے میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ آسو کی تحریک بنیادی طور پر فرقہ وارانہ تحریک ہرگز نہیں ہے، حالانکہ آر ایس ایس جیسے فرقہ وارانہ عناصر نچلی سطح پر اس میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور انھیں اس کوشش میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔ اس پہلو پر ہم کچھ آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔ اس سے قبل ہم اس تحریک میں آسامی مسلمانوں کے رول پر تبصرہ کریں گے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینا بہت ضروری ہے کہ آسامی مسلمانوں اور بنگال سے آئے ہوئے مسلمانوں کے درمیان تہذیبی اور لسانی خلیج حائل ہے۔ آسامی مسلمان، لسانی اور تہذیبی اعتبار سے آسامی ہندوؤں سے بنگالی مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ قربت محسوس کرتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اسی وقت ہوتا ہے جب ہم اس مسئلے پر آسامی مسلمانوں سے تفصیلی بحث کریں۔ اور ان کے جذبات کا صحیح اندازہ کریں۔ آسامی مسلمانوں کے جذبات کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے میں مسلمانوں کے تقریباً سبھی طبقوں کے لوگوں سے ملا، شہری اور دیہاتی دانشور اور اساتذہ، تاجر اور نوکری پیشہ، فن کار اور ادیب۔ ان سب سے گفتگو کر کے میں نے اندازہ لگایا کہ آسامی مسلمان کم و بیش آسو تحریک سے جذباتی طور پر اتنے ہی وابستہ ہیں جتنے کہ آسامی ہندو۔

طلبار کی اس یونین (AASU) میں مسلم طلبار اور اساتذہ بڑا فعال رول ادا کر رہے ہیں۔ نور الحسین اس کے نائب صدر ہیں۔ اور جب پرفل مہنتو، جو اس کے صدر ہیں، کو گرفتار کر لیا گیا تھا تو نور الحسین کو قائم مقام صدر مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ مرتضیٰ علی، ڈاکٹر یونس، شریف الحسن، نسیم اختر وغیرہ بھی آسو کے آفس میں بڑے انہماک اور لگن سے کام کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ آسو نے تحریک کی تاریخ قلمبند کرنے کے لیے تمام اہم واقعات جمع کرنے کا کام شریف الحسن کے ذمے کیا ہے۔ اب تک اس تحریک کے دوران دو مسلم طلبار، قادر علی اور منصور علی پولیس کی گولی سے مارے جا چکے ہیں، جنہیں آسو نے شہید قرار دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آسام میں ہندو، مسلم اتحاد اور ہندوستان کے اور صوبوں اور ریاستوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ ہر آسامی۔ ہندو ہو یا مسلمان ۔۔ اس اتحاد پر

پڑا فخر کرتا ہے۔ پروفیسر اشرف علی جو گوہاٹی کے مشہور کاٹن کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں اور حال ہی میں ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن (DPI) کے طور پر رٹائر ہوئے ہیں، مجھ سے کہنے لگے کہ فرقہ وارانہ فسادات آپکے یوپی، بہار وغیرہ کی قابلِ نفرت روایت ہے۔ آسام ۱۹۴۷ء میں بھی اس وبا ر سے محفوظ رہا۔ ہمیں اس اتحاد پر بڑا فخر ہے اور یہاں مسلمانوں کے ساتھ کسی طرح کا تعصب نہیں برتا جاتا۔ اس کی شہادت آپ کو آسام کا ہر مسلمان دے گا۔ ہمیں اپنی زبان اور اپنی تہذیب اتنی ہی عزیز ہیں جتنا ہمارا مذہب۔ ہم ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے قائل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ساری ہمدردیاں آسو کے ساتھ ہیں۔ کیونکہ یہ لڑائی دراصل ہماری زبان اور تہذیب اور ہمارے تشخص کے بقا کی لڑائی ہے، ہم اس خطرے کو ٹالنے کے لیے پورا زور لگادیں گے۔

پروفیسر اشرف علی نے حالیہ چناؤ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ وزیراعلیٰ سائیکہ ان کے طالب علم رہ چکے ہیں) میں ۲۵ سال تک پولٹیکل سائنس پڑھاتا رہا ہوں۔ میرے نزدیک بدیسیوں کو ووٹر لسٹ میں شامل کرکے کوئی بھی چناؤ کرانا نہ صرف آئین کی خلاف ورزی ہے بلکہ آسام کے عوام کے ساتھ بدترین جرم بھی ہے۔ ہم اس چناؤ کو ہرگز قبول نہیں کریں گے۔

احمدہ رسول جو ہندیق گرلز ہائی اسکول، گوہاٹی کی پرنسپل ہیں، نے بھی کم وبیش انہیں جذبات کا اظہار کیا۔ ان کے بھتیجے فاروق شاہ آسو کے خاص مشیر ہیں۔ احمدہ رسول نے کہا کہ آج ہماری آسامی پہچان کو زبردست خطرہ لاحق ہے۔ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر ہم اس خطرہ کا مقابلہ کررہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ یہاں ہندو مولود شریف میں بڑے شوق سے شریک ہوتے ہیں اور ہم مسلمان ان کے مذہبی تہواروں میں حصہ لیتے ہیں۔ ہماری زبان اور تہذیب ہمارا مقدس بندھن ہے۔ اسے جب بھی خطرہ لاحق ہوگا ہم ہر طرح سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ اگر بنگلہ دیش سے آنے والے غیر ملکیوں کو نہیں روکا گیا تو ہم اقلیت میں رہ جائیں گے اور بنگالی ہماری زبان اور تہذیب کو مٹادیں گے۔ یہ ہم کسی حالت میں برداشت نہیں کرسکتے۔

الکھ جھاریہ دیہات (اس گاؤں میں تقریباً ۱۵۰۰ مسلمان ہیں) جو کامروپ ضلع میں شمور یا ندی کے قریب واقع ہے، کے مسلمانوں نے بھی سادہ طریقے سے یہی بات جتائی۔ بہار علی

اور تمیز علی (دونوں سرکاری ملازم ہیں) نے کہا ہم سب مسلمانوں نے چناؤ کا بائیکاٹ کیا۔ ہمارے آس پاس کے دیہاتوں میں ... ۳ کی آبادی ہے لیکن یہاں صرف ۴ ووٹ پڑے۔ سبھی مسلمانوں نے چناؤ کا متفقہ طور پر بائیکاٹ کیا۔ ہم سب آسامی متحد ہیں۔ اور بنگلہ دیشیوں کے خلاف لڑتے رہیں گے۔

شموریا ندی کے قریب بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر ضروری ہے۔ اس ندی کے آس پاس کافی تعداد میں بنگلہ دیشی مسلمان رہتے ہیں۔ (ویسے انھیں بدیسی کہنا غلط ہوگا کیونکہ یہ لوگ ۸۰ برس سے بھی زیادہ عرصے یہاں آباد ہیں) اور شموریا گاؤں میں بڑی تعداد آسامی ہندوؤں کی ہے چناؤ سے پہلے ۱۳ فروری کو بنگالی مسلمانوں نے شموریا پر حملہ کردیا جس میں ۲ لوگ مارے گئے۔ اور کئی مکان جل گئے۔ شموریا ندی کے اس طرف الکھ جھاریہ میں جیسا کہ اوپر بتایا گیا، مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے۔ ان آسامی مسلمانوں کو خبر ملتے ہی اس حملے کی، وہ آسامی ہندوؤں کا بچاؤ کرنے کے لیے نکل پڑے۔ لیکن ندی کے کنارے انھیں اس طرف آباد بنگلہ دیشی ہندوؤں نے جو نام شودر کہلاتے ہیں، روک لیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آسامی ہندو اور مسلمان اس لڑائی میں ایک طرف ہیں تو بنگالی ہندو اور مسلمان دوسری طرف۔

آج آسام میں لڑائی بنیادی طور پر زبان اور تہذیب کی ہے، مذہب کی نہیں (حالانکہ فرقہ وارانہ طاقتیں بڑی چابکدستی سے اُس کا رُخ تیزی سے مذہب کی طرف موڑنے کی کوشش کررہی ہیں جس پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔) ہر آسامی چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان اپنی زبان، تہذیب اور تشخص کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہے۔ آسام پر چونکہ ۱۹ ویں صدی سے بنگالی زبان کا غلبہ رہا ہے اس لیے انھیں بنگالیوں سے خصوصاً پرخاش ہے۔ اور آج اس تحریک نے بنگالی بدیسیوں (یعنی بنگلہ دیشیوں) کو نکال باہر کرنے کی صورت اختیار کرلی ہے۔ کیونکہ ہندوستانی بنگالیوں کے خلاف ایسی مانگ نہیں کی جاسکتی۔ لیکن ذاتی گفتگو میں بہت جلد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تحریک کا نشانہ دراصل سبھی بنگالی ہیں، وہ ہندوستان کے ہوں یا بنگلہ دیش کے، وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ یہ کہ اس تحریک کی نوعیت لسانی اور تہذیبی ہے، مذہبی نہیں۔ اس بات سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کچھار ضلع میں جہاں بنگالیوں

کی اکثریت ہے اور بنگلہ دیشی مسلمان کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں وہاں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا اور الیکشن میں بھی اس علاقے سے کافی تعداد میں ووٹ ڈالے گئے۔ ان باتوں سے ہی تحریک کی نوعیت بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔

یہ دل چسپ بات ہے کہ جب مسئلہ زبان اور تہذیب کا ہو تو مذہب کا مسئلہ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ یہ بات ہم کشمیر، کیرالا اور تامل ناڈو جیسی ریاستوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں، ان علاقوں کے مسلمان بھی لسانی اور تہذیبی اعتبار سے مقامی غیر مسلموں سے لسانی اور تہذیبی وحدت کی بنا پر زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کا علاقائی تشخص مذہب سے زیادہ علاقائی زبان اور تہذیب سے طے ہوتا ہے۔ اس علاقائی تشخص کو جب بھی خطرہ محسوس ہوتا ہے ان علاقوں کے مسلمان بھی اس کے تحفظ کے لیے آمادۂ پیکار ہو جاتے ہیں۔ اور فرقہ وارانہ منافرت یا تو بالکل پس منظر میں چلی جاتی ہے یا محض ثانوی رول ادا کرتی ہے۔

آسام کا معاملہ تو ہندو مسلم ایکتا کے بارے میں اور بھی زیادہ مضبوط ہے۔ اس ایکتا کی روایت یہاں بہت پرانی ہے۔ ۱۶ ویں صدی میں ویشنو بھگتی تحریک کے بانی شنکر دیو اس ایکتا کے زبردست حامی تھے۔ شنکر دیو نے بت پرستی کی مخالفت کی اور محض بھگتی پر زور دیا۔ شنکر دیو کے ماننے والوں کے مقدس عبادت خانوں میں جو نام گھر کہلاتے ہیں، کوئی مورتی نہیں ہوتی۔ صرف شنکر دیو کی بانی کی مقدس کتاب ہوتی ہے جسے وقتاً فوقتاً پڑھا جاتا ہے۔ شنکر دیو نے اپنے پہلے نام گھر کی بنیاد ایک مسلمان بزرگ سے رکھوائی تھی۔ شنکر دیو چھوت چھات کے بھی قایل نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آسام میں نچلی ذات کے لوگوں سے اتنا بُرا سلوک نہیں کیا جاتا جتنا کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بغیر روک ٹوک کے نام گھروں میں داخل ہو کر عبادت کر سکتے ہیں۔

آسام میں شنکر دیو کے ساتھ ساتھ اذان فقیر کا نام بھی بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ اذان فقیر جو شنکر دیو کے بعد ہوئے ہیں، ان کا نام شاہ میراں تھا اور یہ بغداد سے آئے تھے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر اتنا زور دیا کہ ان کا نام شاہ میراں سے بدل کر شاہ ملن ہو گیا۔ ان کی وجہ سے سارے آسام میں اذان مقبول ہوئی اور اسی لیے انھیں اذان فقیر کہا جانے لگا۔

اذان فقیر نے آسامی زبان میں مذہبی کلام منظوم کیا جنہیں آسام کے لوگ ذِکیر جاری (ذکیر باری؟) کہتے ہیں۔ یہ کلام آج آسامی زبان اور کلچر کا اہم حصہ سمجھا جاتا ہے اور آسام کے سبھی لوگ اس کلام کو بڑے فخر سے گاتے ہیں۔ یہاں ایک مقام ہے جسے آسام کے لوگ پوائے حج (یعنی چوتھائی حج) کہتے ہیں اور یہ عقیدہ ہے کہ جو چار بار اس مقام کی زیارت کرے گا اسے ایک بار حج کرنے کا ثواب ہوتا ہے۔ اس مزار کے سامنے ہی شنکر دیو مسلک کا نام گھر ہے۔ جب مزار کے قریب مسجد میں اذان ہوتی ہے تو نام گھر میں احتراماً گھنٹی بجائی جاتی ہے۔ یہ روایت پچھلی کئی صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر آسام میں ہندو۔مسلم منافرت نہ ہونا تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ کشمیری مسلمانوں کی طرح آسام کا مسلمان بھی مغل حملہ آوروں کو اپنا دشمن تصور کرتا تھا۔ اور آہوم فوج کے ایک مسلم کمانڈر باغ ہزاریکا کے بہادری کے قصے مشہور ہیں۔ جس نے مغلوں کے حملے کو ناکام بنا دیا تھا۔

آسام میں مسلمانوں کی مالی حالت:

آسام میں مسلمان کل آبادی کا ۲۴ فیصد ہیں۔ گوہاٹی جو آسام کا سب سے بڑا شہر اور دار السلطنت ہے، میں مسلمانوں کی آبادی قریب ۱۵ فیصد ہے۔ آسام کے شہروں میں مسلمان نسبتاً زیادہ خوشحال ہیں۔ احمدہ رسول نے مجھے بتایا کہ زمین کی حد بندی کا قانون لاگو ہونے سے پہلے ۵۰ فیصد سے زیادہ گوہاٹی کی زمین اور عمارتوں کے مالک مسلمان تھے۔ حد بندی کا قانون لاگو ہونے کے بعد بہت سی ملکیتیں بک گئیں۔ لیکن آج بھی تقریباً ۲۵ فیصد گوہاٹی کی ملکیتیں مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ گوہاٹی میں آج بھی بڑی بڑی عمارتوں کے مالک مسلمان ہیں۔ آسام کے دیگر شہروں میں بھی شہری ملکیتوں کا بڑا حصہ مسلمانوں کے پاس ہے۔

لیکن دیہاتوں میں بالکل دوسرا نقشہ ملتا ہے۔ مسلمان دوسرے آسامیوں کے مقابلے میں معاشی طور پر پچھڑا ہوا ہے۔ اس کے پاس اوسطاً ۲ یا ۴ بیگھا زمین سے زیادہ نہیں ہوتی اور اسے اکثر دوسرے کے کھیتوں پر مزدوری کرنا پڑتی ہے۔ یوں بھی دیہاتوں میں جانے سے مسلمانوں کی غربت کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی غربت اور پچھڑے پن کا ایک دلچسپ پہلو

بھی ہے۔ آسامی ہندو نسبتاً زیادہ خوشحال ہونے کی وجہ سے جدید طرز زندگی اختیار کرتا جارہا ہے اور آسامی قدروں اور روایتوں کا اسے اتنا پاس نہیں ہے۔ مسلمان ان قدروں اور روایتوں کو آج بھی اسی طرح گلے لگائے ہوئے ہیں۔ جو آسام کی مشترکہ تہذیبی روایتیں ہیں۔ آسامی ہندو یہ کہتا ہوا ملے گا کہ ہماری تہذیبی روایتوں کا سچا محافظ مسلمان ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ تہذیبی اور لسانی تشخص سے آسامی مسلمانوں کو اتنی ہی گہری وابستگی ہے جتنی اپنے مذہب سے اور وہ بنگالیوں کے خلاف تحریک میں پوری جذباتی شدت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

آسو تحریک کے سماجی اور معاشی پہلو

ابھی تک ہم نے آسو تحریک کے سلسلے میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا ہے اور اس تحریک کے نفسیاتی پہلو یعنی تشخص کو ابھارا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس تحریک کے دوسرے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنا بھی بہت ضروری ہے تاکہ ہم آسو تحریک کی پیچیدگیوں اور موجودہ مرحلے میں پیدا ہونے والے فرقہ وارانہ رجحانات کو بھی سمجھ سکیں۔

آسام ہندوستان کی اور ریاستوں کے مقابلے میں معاشی طور پر بہت زیادہ پچھڑی ہوئی ہے۔ یہاں صنعتی ترقی برائے نام ہی ہو سکی ہے۔ پورے آسام میں ہمیں مشکل ہی سے چند صنعتیں نظر آئیں گی جن میں تیل صاف کرنے کی صنعت سب سے نمایاں ہے۔ دوسری قابلِ ذکر صنعت نوگانگ ضلع میں جاگی روڈ پیپر ملس ہے۔ کاغذ بنانے کا یہ کارخانہ ایشیا میں سب سے بڑا کارخانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آسام میں کوئی خاص قابلِ ذکر صنعت نہیں ہے۔ یہاں کے عوام کا سارا دار و مدار زمین اور زمین کی پیداوار پر ہے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ آسام کی زمین نہایت زرخیز ہے اور زیادہ محنت کیے بغیر بھی برہما پتر کی وادی میں کافی چاول پیدا ہوتا ہے۔ سپاری اور ناریل بھی۔ یہاں کافی پیدا ہوتا ہے۔ شمالی آسام میں پٹ سن اور چائے بھی کافی مقدار میں پیدا ہوتی ہے۔ آسام کی زمین کی یہی زرخیزی ہے جو کثیر تعداد میں پڑوسی ملک مشرقی بنگال سے لوگوں کو اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچتی ہے۔

مشرقی بنگال سے ہجرت کا یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ انیسویں صدی میں انگریزوں نے چائے کے باغات کے لیے اُڑیسہ، بہار، آندھرا پردیش اور بنگال سے سستے مزدور درآمد کیے۔ اسی طرح آسام کے آہوم زمینداروں نے (آہوم، آسام کی حکمراں قوم ہے جو تھائی لینڈ کی جانب سے ۱۲ ویں صدی کے آس پاس ہجرت کرکے آسام کی طرف آئی تھی) اپنی بڑی بڑی جاگیروں کی زمینوں پر کام کرنے کے لیے کافی تعداد میں مشرقی بنگال سے سستے مزدور درآمد کیے۔ اس طرح آسام میں بنگالیوں اور دیگر غیر آسامیوں کی آبادی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ آج بھی آسام کے مقابلے میں مشرقی بنگال یعنی کہ بنگلہ دیش میں غربت بہت زیادہ ہے اور وہاں زمین کی بھی آسام کے مقابلے میں بہت زیادہ قلت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی بنگلہ دیش کے غریب دیہاتی سرحد پار کرکے آسام میں داخل ہوکر برہما پُتر کی وادی میں چار زمین (زمین کا وہ حصہ جو برہم پُتر میں سیلاب کے بعد کیچڑ کا علاقہ بن جاتا ہے) کے ٹکڑے پر کھیتی باڑی کرنا شروع کر دیتے ہیں اور محنت کرکے کافی سبزی اور چاول وغیرہ پیدا کر لیتے ہیں۔ ۱۹۴۰ء کے بعد بھی کافی تعداد میں مشرقی بنگال سے لوگ ہجرت کرکے آسام میں آباد ہوگئے تھے۔ نیلی میں جن بنگالی مسلمانوں کا قتل عام ہوا ان میں سے اکثر ۱۹۴۰ء کے آس پاس ہی یہاں آئے تھے۔

آسام کے لوگ خود اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم بڑے کاہل ہیں اور بنگلہ دیشی بڑے محنتی۔ ظاہر ہے اس میں فطری حالات کے تقاضوں کا بڑا عمل دخل ہے۔ آسام میں چوں کہ زمین بڑی زرخیز ہے اور پہلے آبادی بھی بہت کم تھی۔ اس لیے بغیر محنت کیے بہت کچھ مل جاتا تھا۔ اس کے برخلاف مشرقی بنگال میں زندہ رہنے کے لیے بڑی سخت محنت کی ضرورت تھی اس لیے بنگلہ دیشی آسام کی خراب سے خراب زمین میں بھی محنت کرکے خوب پیدا کر لیتے تھے۔ آسام کے لوگ آج بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ان بنگلہ دیشیوں نے اپنی محنت سے ہماری معیشت کو بڑا فائدہ پہنچایا ہے اور ان سے ہم نے چار زمین میں کھیتی باڑی کرنا سیکھا ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بنیادی جھگڑا زمین کا ہے جو مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے اور تہذیبی اور لسانی تشخص بھی اسی کی ایک صورت ہے۔ اگر آسام کی ہمہ جہتی ترقی کی طرف حکومت نے

دھیان دیا ہوتا تو ممکن ہے زمین کا جھگڑا اتنی نازک صورت اختیار نہ کرتا۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ آسامی زبان کی ایک زمانے تک حق تلفی ہوتی رہی اور آسام میں بنگالی زبان اور کلچر کا دور دورہ رہا۔ آسامی زبان کے مسئلے کو لیکر وقتاً فوقتاً جھگڑے ہوتے رہے اور ۱۹۶۰ اور ۱۹۷۲ میں بھی آسامی اور بنگالی بولنے والوں کے درمیان لسانی فسادات ہوئے تھے۔ اس وقت تک دراصل غیر ملکیوں کا مسئلہ اٹھا بھی نہیں تھا۔ آسو تحریک کی بنیاد جس میں غیر ملکیوں کا مسئلہ اٹھایا گیا دراصل ۱۹۷۹ء میں پڑی جبکہ آسامی طلباء نے اپنی مانگوں کا ایک چارٹر تیار کر کے حکومت کو پیش کیا۔

نیلی کا قتلِ عام اور اس کی وجہ :

آسو کی تحریک پچھلے تین برسوں سے بڑی حد تک پُر امن اور سیکولر رہی ہے لیکن اب صورتحال تیزی سے بدلتی جا رہی ہے۔ حالیہ چناؤ کو ہم ایک حد تک خط تقسیم قرار دے سکتے ہیں۔ چناؤ کا اعلان ہوتے ہی آسامیوں میں غصے کی زبردست لہر دوڑ گئی اور انتہا پسند عناصر ابھر کر سامنے آ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے عناصر آسو میں پہلے سے موجود تھے لیکن ان کا غلبہ نہیں تھا۔ دوسری طرف تحریک کی شروعات سے ہی فرقہ پرست عناصر (جن میں آر ایس ایس خاص طور سے قابلِ ذکر ہے) آسو میں گھس رہے تھے لیکن انہیں بھی غلبہ کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن چناؤ کے اعلان نے انتہا پسند اور فرقہ وارانہ عناصر کو وہ موقع فراہم کر دیا جس کا وہ ایک عرصہ سے انتظار کر رہے تھے۔

نیلی کا قتلِ عام دراصل ہمارے اس دہے کا بدترین واقعہ ہے۔ حکومت کو بھی اس سے کسی طرح بھی بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس واقعے کے پیچھے دراصل کئی پیچیدہ عوامل کام کر رہے تھے ہم کسی ایک عامل (FACTOR) پر اس کی ساری ذمہ داری نہیں ڈال سکتے۔ نیلی دراصل ایک تعلقے کا نام ہے۔ قتل عام نیلی میں نہیں بلکہ اس کے آس پاس کے دیہاتوں میں ہوا ہے۔ ان دیہاتوں میں مشرقی بنگال سے ۱۹۴۰ء کے آس پاس آئے ہوئے مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ لوگ اکثر غریب ہیں اور آس پاس کی آسامی آبادی میں ہر طرح سے گھل مل گئے ہیں۔ یہ آسامی زبان بولتے ہیں۔ اور خود آسو کے لیڈروں نے اس بات کا اقرار کیا کہ ہمیں ان سے کسی طرح کی کوئی شکایت نہیں ہے نہ ہی یہ ہماری نظر میں غیر ملکی ہیں۔ آسو کے لیڈروں نے مجھے

ایک دلچسپ بات بتائی کہ عام طور پر بنگلہ دیش سے آئے ہوئے مسلمان بغیر کسی پس و پیش کے آسامی زبان اپنا لیتے ہیں۔ لیکن بنگلہ دیشی ہندو اس معاملے میں بے حد مغرور ہیں۔ اور آسامی زبان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور ہماری لڑائی دراصل اُن سے ہے۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نیلی میں ان مسلمانوں کا قتل عام کیوں ہوا؟ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اس میں کئی عوامل ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔ ہم یہاں ان پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ آسو کے ایک اہم مسلم لیڈر مرتضیٰ علی کا کہنا ہے کہ اس میں آر ایس ایس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں خفیہ طور پر حکومت کا بھی ہاتھ ہے۔ مرتضیٰ علی کے اندازے کے مطابق اس میں کم از کم ... ۴ لوگ مارے گئے ہیں۔ آسو نے حقیقتِ حال کا پتہ لگانے کے لیے اپنی ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی ہے۔ ہم اس کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آسو اس قتل عام کی سخت مذمت کرتی ہے۔

مولوی حفیظ الرحمٰن سے، جو مسجد میں پیش امام ہیں اور جن کے بیوی بچے مارے گئے ہیں، نیلی کے راحت کیمپ میں ملاقات ہوئی۔ حفیظ الرحمٰن نے جن کی عمر ۴۴ سال تھی بتایا کہ جہاں تک مجھے یاد ہے میرے والد کا جنم بھی اسی علاقے میں ہوا تھا۔ ہم آسامی زبان بولتے ہیں اور آسام کے لوگوں سے ہمارے گہرے مراسم ہیں۔ حملہ ہونے سے ایک دن قبل ہی ہم ہفتہ وار بازار میں ملے تھے اور آپس میں بات چیت اور لین دین بھی ہوا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اچانک ہم پر کیوں حملہ کیا گیا۔ یہ بات ضرور ہے کہ آسامی نہیں چاہتے تھے کہ ہم چناؤ میں حصہ لیں۔ لیکن ہمیں تو ووٹ دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ آس پاس کے گاؤں میں کل ملا کر (سڑک کے شمال میں) ۲۵۲ لوگ مارے گئے ہیں۔ اتنی لاشیں ہم نے خود گنی ہیں۔ مرنے والوں میں زیادہ تر عورتیں اور بچے ہی تھے۔ ان دیہاتوں کی کل آبادی ۲۰ ہزار کے قریب ہے۔

سڑک کے جنوب میں اندر جنگل میں بار باری نام کا ایک گاؤں ہے جس کے آس پاس چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں۔ اس گاؤں کے ایک بزرگ ابوبکر صدیق نے ہمیں بتایا کہ ہم پر ۱۸ فروری کی صبح ۱۰ بجے حملہ ہوا۔ اور ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ آسام پولیس بھی حملہ آوروں کے ساتھ تھی دراصل سب سے پہلے آسام پولیس نے نعیم الدین کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔ پھر مار دھاڑ شروع ہوئی۔ ہماری گنتی کے مطابق بار باری کے آس پاس کل ملا کر ۵۰۵ افراد مارے گئے جن میں

زیادہ تر عورتیں اور بچے شامل ہیں۔ زیادہ تر مرد ہی بچے ہیں کیونکہ وہ بھاگ نکلے۔ میں نے ریلیف کیمپ میں جس سے بھی بات کی یہی بتایا کہ میری بیوی بچے بھی مارے گئے۔ ابوبکر صدیق اور ابوالحسن نے بتایا کہ ۱۹ ہندو بنگالی خاندان بھی اس حملہ کی زد میں آئے۔ ان کے گھر جلا دیے گئے۔

حملہ آوروں میں لالونگ قبیلے کے لوگ زیادہ تھے۔ لیکن ان میں آسامی ہندو اور کچھ اور قبائلی بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔ حملہ منظم طور پر کیا گیا تھا۔ اور اس کی باقاعدہ تیاری کی گئی تھی۔ ابوبکر صدیق کا کہنا تھا کہ حملے کی وجہ چناؤ کی دشمنی تھی۔ ہم ووٹ دینا چاہتے تھے اور آسامی ہمیں روکنا چاہتے تھے۔ آسو اور گن پریشد کے لوگوں نے آکر ہمیں دھمکی دی تھی کہ اگر ووٹ دیا تو ہم تمہیں مار ڈالیں گے۔ اور یہی ہوا بھی۔ ہم نے موری گاؤں تھانے میں شکایت بھی درج کرائی لیکن ہمیں سی۔ آر۔ پی۔ ایف کی مدد نہیں مل سکی۔ یہ سب الیکشن ڈیوٹی پر تعینات تھے۔

آسام میں ۲۵۰۰۰ آر ایس ایس والنٹیر:

اس میں شک نہیں کہ آسو اور گن پریشد میں شامل انتہا پسند اور فرقہ پرست عناصر نے حملہ آوروں کو بھڑکا دیا۔ خود آسو لیڈر مرتضیٰ علی نے مجھے بتایا کہ موری گاؤں میں آر ایس ایس کی شاخ موجود ہے اور بڑی فعال ہے۔ یاد رہے کہ بارباری گاؤں موری گاؤں کے ہی قریب واقع ہے۔ آج آسام میں آر ایس ایس کی شاخیں بڑی تیزی سے پھیلتی جارہی ہیں اور ایک اندازے کے مطابق اس وقت آسام میں آر ایس ایس کے ۲۵۰۰۰ والنٹیر کام کر رہے ہیں۔

اور باتوں کے ساتھ یہاں ایک اور بات کا ذکر ضروری ہے۔ بارباری گاؤں میں اکثر بنگلہ دیشی مسلمانوں کے پاس اوسطاً ۵۰ سے ۶۰ بیگھا زمین ہے جو عام اوسط سے بہت زیادہ ہے۔ اس میں سے ۲۰ یا ۳۰ بیگھا زمین اکثر ان کے پاس رہن رکھی ہوئی ہے۔ یہ زمین لالونگ قبیلے کے لوگوں کی ہے۔ ابوبکر صدیق نے مجھے بتایا کہ حملہ آوروں نے سب سے پہلے رہن کی ان دستاویزوں کو آگ لگا دی۔ اب ہمارے پاس گروی کی رقم واپس لینے کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس حملے میں یہ معاشی پہلو بھی کام کر رہا تھا۔ ظاہر ہے لالونگ قبائلیوں کو اپنی زمین واپس ملنے کی امید میں بھڑکا کر لایا گیا ہو۔ ویسے بھی آج

آسام کی تحریک میں زمین جھگڑے کا بنیادی باعث بنی ہوئی ہے۔ چناؤ کے اعلان نے اس غصّے کو اور بھڑکا دیا جس کے نتیجے میں اتنا خون خرابہ ہوا۔ یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ آج آسام میں سارا خون خرابہ دیہاتوں میں ہو رہا ہے حالانکہ تحریک کی لیڈر شپ شہریوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کا مرکز گوہاٹی ہے۔ آسامی ہندو ہوں یا بنگلہ دیشی مسلمان سبھی دیہاتوں میں مارے جا رہے ہیں۔ کیونکہ بنیادی جھگڑا زمین پر قابض ہونے کا ہے۔

یہاں ایک اور دلچسپ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے۔ نیلی میں آسامی مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۴۰ فیصد ہے لیکن ان میں سے ایک بھی آسامی مسلمان نہیں مارا گیا۔ اگر یہ محض فرقہ وارانہ جھگڑا ہوتا تو آسامی مسلمانوں کا بچنا مشکل ہو جاتا۔

ایک اور جگہ بنگلہ دیشی مسلمانوں کا قتل عام ہوا ہے جس کا ذکر اخباروں میں نہیں ہے۔ اس جگہ کا نام ہے شول کھوا جو منگل دوئی ضلع میں واقع ہے۔ یہاں کم از کم ۱۰۰ لوگ مارے گئے ہیں۔ حزوز علی نے جو ایک آسامی مسلمان ہیں، مجھے بتایا کہ پہلے بنگلہ دیشی مسلمانوں نے ۱۵ فروری کو ٹھیکرا باری پر حملہ کر کے ۲۲ آسامیوں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد آسامیوں نے بنگلہ دیشی مسلمانوں پر حملہ کیا جس میں تقریباً ۱۰۰ آدمی مارے گئے۔ ان بنگلہ دیشیوں میں زیادہ تر نئے مہاجر تھے۔ اور ان پر حملہ کرنے والوں میں آسامی ہندو اور مسلمان بھی شامل تھے۔ لیکن بدلاگری گاؤں کی مسجد کے پیش امام مولوی حسن علی نے مجھ سے کہا کہ آسامی مسلمان حملہ آوروں میں شامل نہیں تھے۔ اور یہ کہ شول کھوا کے بنگلہ دیشی مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔

آخر میں یہ بات جتانا بھی ضروری ہے کہ آسو تحریک پر فرقہ پرست عناصر کا غلبہ بڑھتا جا رہا ہے اور یہ بڑا ہی خطرناک رجحان ہے۔ فرقہ پرست عناصر نے کہیں کہیں آسامی مسلمانوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔ ۲۰ مارچ کو نوگاؤں ضلع میں ایک آسامی مسلم نوجوان کی لاش ایک کھیت میں سے ملی۔ اس نوجوان کو دو روز قبل ہی شیپا جھار پولس تھانے کے سامنے سے اغوا کیا تھا ایم طاہر نے جو آسامی مسلمان ہے، مجھ سے غصّے کے عالم میں کہا کہ آسامی مسلمان دل و جان سے آسو تحریک کے ساتھ رہا ہے لیکن اب آسامی مسلمانوں کو ہی مارا جا رہا ہے اس لئے آسامی مسلمان

اب اس تحریک کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ بعد میں احمدہ رسول نے مجھے بتایا کہ گوہاٹی یونیورسٹی علاقے میں ۹ آسامی مسلمان ایک ہفتے کے دوران مارے جا چکے ہیں۔ اور یہ سب کچھ آر ایس ایس کی جانی بوجھی سازش کے تحت کیا جا رہا ہے۔ تاکہ ہندو مسلم اتحاد ختم ہو جائے۔ آسو کو چاہیئے کہ ان واقعات کے خلاف سختی سے قدم اُٹھائے۔ اور ان کی روک تھام کرے۔

لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ آسو چاہتے ہوئے بھی ایسا کرنے میں مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گی۔ آسو کی لیڈرشپ ناتجربہ کار طلبا کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف سازشی سیاست میں پختہ کار آر ایس ایس کی منظم قوت ہے جس کے پاس مارواڑیوں کا سرمایہ بھی ہے۔ حقیقت میں آسامیوں کا معاشی استحصال مارواڑی کر رہا ہے۔ آسام کی معیشت پر آج اس کا مکمل قبضہ ہے۔ آسامیوں میں جس دن یہ احساس جاگے گا ان کے غصے کا نشانہ مارواڑی بنے گا۔ لیکن آج وہ بڑی چالاکی سے اس غصے کا رُخ بنگلہ دیشیوں کے خلاف موڑے ہوئے ہے۔ مارواڑی سرمایہ دار بڑی چالاکی سے غریبوں کو غریبوں کے خلاف لڑا رہا ہے۔

(۱ اپریل ۱۹۸۳ء)

مالے گاؤں کا فساد
سیاسی اور معاشی تجزیہ

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات اب آئے دن کی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فساد ہونا اب کوئی خاص خبر نہیں ہوتی بلکہ فساد نہ ہونا البتہ ضرور خوشگوار حیرت کی بات ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ہر اسٹیٹ میں چند شہر ایسے ہوتے ہیں جنہیں فرقہ وارانہ فسادات کے اعتبار سے حساس (SENSITIVE) کہا جا سکتا ہے۔ مہاراشٹر میں سرکاری ذرائع کے مطابق پونے، احمد نگر، جلگاؤں، آکولہ، امراؤتی، بلڈھانہ، بمبئی، ناسک، پربھنی اور تھانے جیسے اضلاع فرقہ وارانہ فسادات کے اعتبار سے حساس سمجھے جاتے ہیں۔ اور مقامات کے علاوہ بھونڈی جو تھانہ ضلع میں ہے اور مالے گاؤں جو ناسک ضلع میں ہے، فرقہ وارانہ فسادات کے بڑے مرکز بن گئے ہیں۔ ان دونوں شہروں میں فرقہ وارانہ تناؤ بنا ہی رہتا ہے ان دونوں شہروں میں محنت کش طبقے کے لوگ اکثریت میں ہیں اور بڑھتی ہوئی مہنگائی اور مفلسی کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ تشدد کا شکار بنے رہتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے شہر میں جہاں محنت کش طبقے کے لوگ اکثریت میں ہیں اور اچھا خاصہ سیاسی شعور بھی رکھتے ہیں اور بائیں بازو کی ٹریڈ یونینیں بھی ہیں، کیوں آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں۔؟ اور پھر مالے گاؤں اور بھیونڈی میں ایک زمانے تک قومی اور جمہوری شعور اور جنگ آزادی میں شرکت کی روایت بڑی مضبوط رہی ہے۔ مالے گاؤں میں بنکروں کی بڑی بھاری اکثریت ہے۔ اور ان کے زیادہ تر آباؤ اجداد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شمالی ہندوستان میں سب کچھ قربان کر کے روزگار کی تلاش میں ہجرت کر کے یہاں چلے آئے تھے۔ لیکن یہاں آکر بھی

آزادی کی اُمنگ اور اس کے لیے قربانیاں دینے کا جذبہ برابر برقرار رہا۔ خلافت تحریک کے درمیان چند مسلمان آزادی کے متوالوں نے برطانوی سرکار کے ظالم افسر بھاسکٹ راؤ کو جلاکر خاک کر دیا تھا۔ جبکہ وہ پناہ لینے کے لیے ایک مندر میں گھس گیا تھا۔ اس میں چند ہندو بھائی بھی شریک تھے۔ بعد میں مسلمانوں نے ہندو عبادت گاہ کے نقصان کی تلافی کرنے اور اس کی طرف اپنا جذبۂ احترام دکھانے کے لیے فی ساڑی ایک روپیہ ادا کرکے فنڈ اکٹھا کیا اور مندر کی دوبارہ تعمیر کی۔ آج بھی واقعہ فرقہ پرست طاقتیں اپنے مفاد کے لیے توڑ مروڑ کر پیش کر رہی ہیں جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

جہاں ایسی صحتمند روایتیں رہی ہوں اور ہندو مسلم اتحاد پر فخر کیا جاتا رہا ہو وہی شہر آج فرقہ وارانہ فساد کی زد میں کیوں؟ ماہرینِ سماجیات (SOCIAL SCIENTISTS) کے لیے یہ بڑا اہم سوال ہے۔ اس کا صحیح جواب ہمیں اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ ہم اس مسئلے کو مالے گاؤں میں ہو رہی سماجی اور معاشی تبدیلیوں کے تناظر میں دیکھیں اور اس تبدیلی سے پیدا ہونے والی نئی سماجی اور معاشی طاقتوں کا جائزہ لیں۔ اس سے پہلے ہم اختصار کے ساتھ فسادات کے زد میں آنے والے شہروں کی چند خصوصیات پر روشنی ڈالیں گے۔

یوں تو فساد منظم کوشش کر کے کہیں بھی کروایا جا سکتا ہے لیکن جو مقامات اکثر فساد کی زد میں آتے رہتے ہیں وہاں چند خصوصیات پائی جاتی ہیں جنہیں مدِنظر رکھنا بہت ضروری ہے یہ خصوصیات حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) فساد زدہ علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۲۰ فیصد سے زیادہ ہوتا ہے۔

(۲) ایسا شہر اکثر درمیانے درجے کا ہوتا ہے یعنی اس شہر کی آبادی ۲ لاکھ سے ۵ یا ۷ لاکھ تک ہوتی ہے۔

(۳) ایسے شہروں میں اکثر ہندو تاجروں یا چھوٹے کارخانہ داروں کا مقابلہ مسلم تاجروں یا چھوٹے کارخانہ داروں سے ہوتا ہے۔

(۴) ایسے شہر میں اکثر ترقی اور تبدیلی کی رفتار دوسرے علاقوں کے مقابلے میں قدرے تیز ہوتی ہے جس کا اثر شہر یا شہر کے آس پاس کے علاقوں میں زمینوں کی قیمتوں پر بھی پڑتا ہے۔

(۵) اس شہر یا علاقے میں فرقہ واریت کی پرانی روایت بھی چلی آتی ہے۔

پچھلے چند دہوں میں جہاں جہاں فسادات ہوئے ہیں وہاں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں چاہے وہ علی گڑھ ہو یا مراد آباد، بنارس ہو یا میرٹھ، بڑودہ ہو یا گودھرا، بہار شریف ہو یا جمشید پور۔

اب ہم مالے گاؤں کی طرف آتے ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت یہ سوال ہے کہ مالے گاؤں کی ماضی کی صحت مند روایتوں میں کیوں تبدیلی آئی اور وہ کون سے عوامل یا طاقتیں ہیں جنہوں نے وہاں کی فضا میں فرقہ واریت کا زہر گھول دیا؟ ہم نے مضمون کے شروع میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سماجی اور معاشی تبدیلی نئے طبقوں، گروہوں اور طاقتوں کو جنم دیتی ہے اور ان کے مفادات کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ لیکن ان مفادات کا براہ راست اظہار نہ کرتے ہوئے انھیں کسی نظریاتی یا لسانی یا مذہبی یا کلچرل لباس میں ملبوس کرکے پیش کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم فرقہ واریت کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ یہ مذہب کو ذریعہ بنا کر سیکیولر مقاصد حاصل کرنے کا نام ہے۔

مالے گاؤں میں ۱۹۶۳ء سے فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو دھیرے دھیرے تیز ہوتا چلا گیا۔ مالے گاؤں کی آبادی آج ۲½ لاکھ کے قریب ہے (غیر سرکاری اعداد کے مطابق تقریباً ۴ لاکھ) اور مسلمان ۷۰ فیصد ہیں۔ مالے گاؤں ایک عرصے سے پاورلوم کا مرکز رہا ہے۔ شروع سے مسلمانوں کی اکثریت بنکر طبقے سے تعلق رکھتی ہے جو اکثر مزدوری کرتے ہیں آج بھی گھر گھر میں عورتیں چرخوں پر سوت کاتتی ہیں۔ جیسے جیسے ملک میں اور خصوصاً مہاراشٹر میں معاشی ترقی اور تبدیلی کی رفتار تیز ہوتی گئی، مالے گاؤں بھی ایک ذیلی صنعتی شہر کے اعتبار سے ترقی کرنے لگا اور چند ایسے مسلمان جو صنعت و تجارت کی صلاحیت رکھتے تھے، اس میدان میں آگے آنے لگے۔ آج مالے گاؤں میں ۱۵۰ بڑے پاورلوم اور سائزنگ مشین میں سے ۱۴۷ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں اور صرف ۳ ہندوؤں کے ہاتھ میں۔

اُدھر ہندوؤں کے ہاتھ میں سوت اور ساڑیوں کی تجارت تھی اور دیگر اشیاء کی بھی۔ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ ہندو تاجر بھی اپنی پوزیشن کو نہ صرف مضبوط کرتے رہے بلکہ اس کی

توسیع بھی کرتے رہے۔ اس طرح معاشی ترقی کے ساتھ سماج میں حرکت پیدا ہوئی اور نئے طبقے وجود میں آنے لگے۔ ہندوستان جیسے ملک میں، ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے، جہاں کئی مذاہب کے لوگ آباد ہیں اور یہاں کے لوگوں پر مذہب کی گرفت بھی بڑی مضبوط ہے۔ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ براہِ راست طبقاتی کشمکش تیز ہونے کے بجائے یہ مذہبی گروہوں کی کشمکش کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ یہی بات ان درمیانے درجے کے شہروں میں ہو رہی ہے۔ جہاں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی تجارت اور چھوٹی صنعتوں میں ترقی کرنے کی صلاحیت پیدا کر رہے ہیں۔ طبقاتی کشمکش مذہبی گروہوں کے درمیان کشمکش کی صورت اختیار کرنے لگتی ہے۔

مالے گاؤں کے فرقہ وارانہ امن میں خلل پڑنے کی بھی یہی وجہ ہے۔ یہاں مسلمانوں کا ایک طبقہ ایک حد تک کامیابی کے ساتھ پاور لوم صنعت میں ترقی کر رہا ہے اور اس طبقے کا سیدھا ٹکراؤ ہندو تاجر طبقے سے ہوتا ہے۔ درمیانے درجے کے شہروں میں مذہبی قدامت پرستی بڑے صنعتی شہروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے اور ایسے حالات میں نئے ابھرنے والے طبقے ایسی جماعتوں یا نظریوں کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں جو قدامت پرستی کے حامی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آر۔ ایس۔ ایس اور بھارتیہ جنتا پارٹی جیسی فرقہ پرست جماعتیں ایسے ہی شہروں میں اُبھرے ہوئے پیٹی بورژوا (نچلے اور متوسط درجے کے تجارتی طبقوں) طبقوں میں اپنی جڑیں پھیلاتی ہیں۔

مالے گاؤں میں ندی کے دوسری طرف ایک قلعہ ہے، قلعے کے پیچھے مالے گاؤں کے خوشحال طبقوں کی رہائش گاہیں اور اس کے پیچھے یوپی سے آئے ہوئے دودھ کا پیشہ کرنے والے اہیروں کی بستی ہے۔ جنہیں مقامی زبان میں گوالے بھی کہا جاتا ہے۔ قلعہ آج کل سرکاری قبضے میں ہے اور اس قلعے میں روزانہ آر ایس ایس کی پریڈ ہوتی ہے۔ آر ایس ایس کے رضاکاروں میں زیادہ تر اہیروں کے بچے ہیں۔ ان کی لیڈر شپ متوسط طبقے کے پیشہ ور ایڈوکیٹ بنتا مبیکر جیسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کے لیے سرمایہ ہندو تاجر طبقہ مہیا کرتا ہے کیونکہ وہ آر ایس ایس جیسی جماعتوں کو اپنے مفادات کی محافظ سمجھتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اہیر آر ایس ایس کے

قوت بازو، تاجر طبقہ اس کا سرمایہ کار اور پڑھا لکھا پیشہ ور طبقہ اس کا ذہن ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں میں کوئی ایسی باقاعدہ منظم فرقہ پرست جماعت تو نہیں ہے جس کا مقابلہ آر ایس ایس سے کیا جا سکے لیکن کچھ ایسے بکھرے ہوئے علیحدہ علیحدہ گروہ اور سیاسی مفادات رکھنے والے افراد ضرور ہیں جو مذہبی قدامت پرستی کو استعمال کرتے ہیں۔ ۸ ویں درجے کی درسی کتاب پر جو تنازعہ مالے گاؤں میں ہوا اور جس کو لیکر ۲۰ نومبر ۱۹۸۲ء میں فرقہ وارانہ فساد برپا ہوا اس میں ایسے گروہوں اور افراد کا رول نمایاں تھا۔ حالاں کہ درسی کتب میں رسولِ کریمؐ سے متعلق جو زبان استعمال کی گئی تھی اس پر احتجاج حق بجانب تھا لیکن بعض گروہوں اور افراد کی وجہ سے یہ احتجاج معقول جمہوری حدوں میں نہ رہتے ہوئے تشدد اور لوٹ مار کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا۔ جس کی ابتدائی ذمّے داری انہیں افراد اور گروہوں پر تھی۔ یہ بات الگ ہے کہ بعد میں سارا نقصان مسلمانوں کا ہی ہوا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ طبقاتی کشمکش اور معاشی اور سیاسی مفادات کی جنگ مذہبی کشمکش کی صورت میں لڑی جاتی ہے۔ اس سے ان مفادات کو ایک اور فائدہ پہنچتا ہے مذہبی مناقشے میں الجھ جانے کی وجہ سے محنت کشوں کا شعور بھی فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے اور معاشی انصاف کے لیے ان کی جدوجہد کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس طرح صنعت کار ان سے کم مزدوری پر کام کرا سکتا ہے۔ اور دوسری طرف ہندو تاجروں کو زیادہ منافع کمانے کے لیے سستا مال مہیا ہو جاتا ہے۔ اور فسادات ہوتے ہیں تو جانی اور مالی نقصان بھی زیادہ تر غریب اور مزدور طبقے کا ہوتا ہے۔ محنت کش طبقہ اس طرح سے ہمیشہ دوہرا شکار ہو جاتا ہے۔ مراد آباد، میرٹھ، علی گڑھ، بنارس، بھیونڈی، مالے گاؤں ہر جگہ ہمیں یہی صورت حال نظر آئے گی۔ اوپری طبقے کے معاشی اور سیاسی مفادات تو اپنے مفادات کی جنگ نظریاتی شکل میں لڑتے ہیں۔ اور نچلے اور خصوصاً محنت کش طبقے اس کی قیمت اپنے طبقاتی مفادات کے علاوہ اپنے خون سے بھی ادا کرتے ہیں۔

مالے گاؤں کا حالیہ فساد بھی اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ اس فساد کی قیمت مالے گاؤں کے ان مسلمانوں نے جن کا تعلق محنت کش طبقے سے ہے اپنے خون سے چکائی ہے۔ فساد میں

ظاہر ہے پی اے سی۔ ایس آر پی کا عتاب مسلمانوں پر ہی نازل ہوتا ہے۔ اور وہ بھی خصوصاً غریب اور نادار مسلمانوں پر۔ میرٹھ میں فیروز بلڈنگ میں بھی ایسے ہی غریب مسلمان آباد تھے۔ جنہیں گھروں سے نکال نکال کر پی اے سی نے گولی کا نشانہ بنادیا۔ وہاں بھی خود جاکر میں نے معاملے کی تحقیق کی تھی۔ مالے گاؤں میں بھی ۴ غریب مسلمان مارے گئے۔ جن میں ایک ۹ ماہ کی بچی بھی شامل ہے اور ۵۶ کے قریب بری طرح زخمی ہیں۔ ایس۔ آر۔ پی کا عتاب غریب مسلمانوں پر ہی کیوں نازل ہوتا ہے۔؟ ایک تو ان کے مکان کچے ہوتے ہیں ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ جاتے ہیں، اور دوسری طرف ایسے لوگوں کی کہیں پہنچ نہیں ہوتی، کوئی سیاسی اثر نہیں ہوتا۔ انہیں جان سے مارو، زخمی کردیا گرفتار۔ یہ کس سے فریاد کریں گے ؟ ان کا کون پرسان حال ہوگا ؟ اس طرح ایس آر پی والے مسلمانوں پر اپنا عتاب بھی نازل کرسکتے ہیں اور اس کے نتائج سے بھی محفوظ رہ سکتے ہیں۔

مالے گاؤں کا فساد محض پٹاخے چھوڑنے کا نتیجہ نہیں تھا۔ یہ تو چنگاری تھی جو بارود کے ڈھیر کو لگائی گئی۔ آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کے حامی پنتامبیکر اور ان کے ساتھیوں نے مسلسل کئی مہینوں سے زہریلی مہم چلا رکھی تھی۔ کسی نہ کسی مسئلے کو اٹھا کر فرقہ وارانہ زہر پھیلایا جا رہا تھا۔ پچھلے سال ششر کے نام کے ایک لڑکے کو ایک مسلم مزدور کی بیٹی سے محبت ہوگئی۔ لڑکی کے ماں باپ نے اس شرط پر شادی کی اجازت دے دی کہ لڑکا اسلام قبول کرلے۔ لڑکے اور لڑکے کے ماں باپ اس بات پر راضی ہوگئے اور ہنسی خوشی یہ شادی ہوگئی۔ ششر کے والد جو برہمن ہیں، نے بھی ایک مہار عورت سے شادی کی تھی اور وہ بڑے وسیع المشرب آدمی ہیں۔ لیکن پنتامبیکر اور ان کے ساتھیوں کو یہ بات بھلا کیسے گوارا ہوجاتی۔ انھیں مالے گاؤں دوسرا میناکشی پورم نظر آنے لگا۔ اور انھوں نے تبدیلئ مذہب کا ہندوؤں پر خوف طاری کرنے کی خوب کوشش کی۔

آزادی کے شہداء کی یادگار پر نام کی تختی لگاتے وقت بھی پنتامبیکر اور اس کے ساتھیوں نے خوب فرقہ واریت کا زہر پھیلایا جیسا کہ مضمون کے شروع میں بتایا گیا ہے چند مسلم آزادی کے متوالوں نے ایک برطانوی حکومت کے ظالم افسر کو مندر میں جلا کر

مار ڈالا تھا۔ جس کے نتیجے میں ان مسلم نوجوانوں کو پھانسی ہوئی تھی۔ ان کے نام شہدائے آزادی کی یادگار پر لکھے جانے تھے اور ان ناموں کی تختی بھی تیار ہو چکی تھی۔ لیکن پُنتا مبیکر اور ان کے ساتھیوں نے شور مچایا کہ یہ مجاہدانِ آزادی نہیں بلکہ خلافتِ تحریک کے "غنڈے" تھے۔ جنہوں نے ہندو مندر کی توہین کی۔ نتیجے میں مالے گاؤں کی فضا اور مکدر ہوئی۔ دراصل یہی وجہ تھی کہ پرانت آفیسر مسٹر مونجھے نے پنتا مبیکر، مپیکر اور ملیند کلکرنی کو مالے گاؤں سے جلاوطن کرنے کا نوٹس دیا تھا۔ لیکن سیاسی دباؤ کے تحت آج تک اس نوٹس پر عملی کارروائی نہیں ہو سکی۔ اور آخر فساد کا لاوا پھٹ پڑا۔

مسجد کے سامنے پٹاخے چھوڑنے کے پیچھے دہری چال تھی۔ ایک طرف مسلمانوں کو اکسانا تھا۔ اور دوسری طرف یہ ثابت کرنا کہ مسلمان کرکٹ میچ میں ہندوستان کی فتح پر خوش نہیں۔ جبکہ حالانکہ مسلمانوں نے مالے گاؤں میں ۲۵ر جون سنیچر کے دن اس فتح پر خوب خوشیاں منائی تھیں اور مٹھائیاں بھی تقسیم کی تھیں۔ ۲۷ر جون کو مسلمان فتح یابی کے جشن میں بھی شریک ہونے والے تھے۔ لیکن پُنتا مبیکر اور اُن کے ساتھی ایک حد تک مسلمانوں کو مشتعل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پٹاخے چھوٹنے کی خبر پھیلتے ہی ادھر ادھر مار پیٹ شروع ہو گئی جس میں مسلمانوں نے بھی حصہ لیا۔ کچھ ہندوؤں کی دوکانیں بھی نذر آتش کی گئیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں پر خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ اور پچھلے فساد میں مسلمانوں کا مالی نقصان بھی بہت ہوا تھا۔ اسی لیے ابتدا میں ان کا ردِ عمل بھی شدید تھا۔

کرفیو نافذ ہونے اور ایس آر پی آ جانے کے بعد پھر نقشہ ہی بدل گیا۔ ایس آر پی نے اپنے معمول کے مطابق گھروں میں گھس کر نشانہ لیا اور ۹ ماہ کی بچی شبانہ کو بھی نہیں بخشا۔ بچی ماں کی گود میں سوئی ہوئی تھی اور ماں سوت کات رہی تھی۔ بچی کی کھوپڑی پھٹ گئی۔ اور دماغ کے ٹکڑے اُڑ کر چھت اور دیواروں کے اوپر لگ گئے۔ ایک ۱۹ سالہ نوجوان متین جو شور سنکر باہر دیکھنے کے لیے نکلا فوراً ایس آر پی کی گولی کا نوالہ بن گیا۔ مالیگاؤں کو پانی مہیا کرنے والی پائپ لائن توڑ دی گئی تو ایس آر پی والوں نے غریب مسلمانوں کے جھونپڑوں میں پانی کے مٹکے توڑ کر سارا پانی بہا دیا کہ رمضان کے مہینے میں انھیں کسی طرح

سے پانی میسر نہ ہو اور جب کرفیو میں وہ مجبور ہو کر مسجد یا کہیں آس پاس سے پانی لانے جائیں تو وہ ان کی لاٹھی اور گولی سے تواضع کریں۔

بہرحال ہم یہاں واقعات کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ ہمارا مقصد یہاں واقعات کا تجزیہ کر کے یہ دکھانا تھا کہ فرقہ واریت کب اور کیوں پھیلتی ہے اور اُسے پھیلانے کا کون ذمے دار ہوتا ہے۔ مالے گاؤں کا فساد اور وہاں ہونے والی سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلی اور اس پس منظر میں پھیلتا ہوا فرقہ واریت کا زہر اس کی بہترین مثال ہے۔

(جولائی ۱۹۸۲ء) ———

حیدر آباد کا فساد

تحقیقاتی اور تجزیاتی رپورٹ

حیدر آباد پرانا شہر فساد کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ اس شہر میں بھی وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو فرقہ وارانہ فسادات کے لیے جدید ہندوستان میں ضروری ہوتی ہیں۔ یہاں بھی مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے۔ ان کی آبادی کا تناسب تقریباً ۳۰ فی صد ہے۔ پرانے شہر میں بھی تقریباً یہی تناسب ہے جدید ہندوستان میں ایسے شہر فساد کی زد میں جلدی آتے ہیں جہاں مسلم آبادی کا تناسب ۲۰ سے ۵۰ فیصد ہو۔ اور اگر ماضی میں بھی فسادات کی تاریخ رہی ہو تو یہ امکان اور بڑھ جاتا ہے۔ حیدرآباد تو آزادی سے پہلے نظام کے زیر حکومت تھا۔ اور آزادی کے بعد بڑا خونریز پولیس ایکشن ہوا رضا کار کی تحریک کی کڑوی کسیلی یاد بھی آج تک لوگوں کے ذہن میں تازہ ہے۔ نوجوانوں کی نئی نسل بھی ابھی اسے نہیں بھولی ہے اور کچھ فرقہ پرست تنظیمیں اس یاد کو تازہ کرتی رہتی ہیں تاکہ فرقہ وارانہ فضا بنی رہے اور اس کی آڑ میں وہ اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرتی رہیں۔

چنانچہ ہمارے محقق کو تحقیقات کے دوران چار مینار کے قریب ایک مارواڑی نوجوان نے بڑی صاف گوئی سے بتایا کہ نظام کی حکومت کے دوران غریب مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ مسلمان غریب تو یہ کہہ کر کم از کم اپنی تسلی کر لیتا تھا کہ حکومت اس کے اپنے ہم مذہبوں کی ہے لیکن ہندو مسلمانوں کے زیر حکومت ہونے پر نہ صرف اپنی توہین محسوس کرتا تھا بلکہ اپنی غربت کا ذمہ دار بھی انہیں کو قرار دیتا تھا۔ یہ احساس صرف ایک مارواڑی نوجوان کا ہی نہیں ہے۔ یہ درمیانے اور نچلے درمیانے طبقوں کے ہندوؤں کا حیدر آباد میں نمائندہ احساس ہے جو لاشعور میں دبا رہتا ہے

اور فرقہ پرست جماعتوں کے منظم پروپیگنڈا کے تحت وقتاً فوقتاً ابھرتا رہتا ہے۔ درمیانے درجے کے شہروں میں (حیدرآباد درمیانے درجے کا شہر ہے) پیٹی بورژوا طبقے جو یا تو چھوٹے پیمانے کی تجارت سے تعلق رکھتے ہیں یا نوکری پیشہ ہوتے ہیں، عام طور پر مذہبی دقیانوسیت کا شکار ہوتے ہیں۔ اور اُن پر مذہب کی بنیاد پر کسی بھی سیاسی پروپیگنڈا کا بڑی تیزی سے اثر ہوتا ہے۔

حیدرآباد کا پرانا شہر ہی فساد کی زد میں کیوں آتا ہے؟ اس کے لیے ہمیں یہاں کا تھوڑا سا پس منظر ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ نظام حکومت کا ٹوٹنا مسلم جاگیردار معاشرے کے لیے بڑا زبردست سانحہ تھا۔ اس حکومت کے ساتھ ان کی معاشی بنیادیں ڈھے گئیں۔ جاگیردار طبقہ ہی معاشی بحران کا شکار نہیں ہوا بلکہ ان پر منحصر مسلمانوں کی بڑی تعداد مفلسی اور اس کی ہلاکت خیزیوں کا شکار ہوگئی جاگیرداروں کی زمینیں اور جائدادیں دیکھتے دیکھتے بک گئیں۔ اور رہا سہا پولیس ایکشن میں لُٹ گیا جن پر عام مسلمانوں کا سہارا تھا۔ جب وہی تعرِ مذلت میں آن گرے تو پھر ان کی غربت اور مفلسی کا ذکر ہی کیا۔ آج بھی پرانے شہر میں ایسے ہی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے جو اس سانحے کا شکار ہوئے تھے۔ ان کے کئی دہے مفلسی اور ذلت کی زندگی میں بسر ہوئے ان کے پاس نہ تجارت کا ہنر تھا نہ صنعتی کاروبار میں لگانے کے لیے سرمایہ اور تجربہ، پرانا نظام تو دغا دے ہی چکا تھا۔ رضاکار تحریک جو جاگیردار طبقے کا آخری سہارا تھی۔ پولیس ایکشن کے ذریعے کچل دی گئی اور اپنی تلخ یادیں فرقہ پرستوں کے استحصال کے لیے چھوڑ گئی۔

ادھر آزادی کے بعد ہندوؤں کے نئے طبقے اپنی معاشی اُمنگوں کے ساتھ اُبھرنے لگے اور تیزی سے ترقی کی جانب قدم اٹھانے لگے۔ ریڈیز اور دوسری پچھڑی ہوئی ذاتیں اس خلا کو پر کرنے لگیں جو مسلمانوں کے زوال کی وجہ سے پیدا ہوگیا تھا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ جہاں زوال پذیر طبقہ مذہب کا سہارا لیتا ہے (کیونکہ روایتی مذہب کے ساتھ ساتھ پورا روایتی معاشرہ وابستہ ہوتا ہے اور اس معاشرے کی حفاظت اور مذہب کی حفاظت میں ان حالات میں فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔) وہاں نیا ابھرتا ہوا طبقہ بھی اس کو اپنی امنگوں کا آئینہ دار بناتا ہے۔ ایک پس ماندہ سماج میں، سماجیات کے ماہر اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ مذہب اور ذات پات کے نام پر اُبھرتے ہوئے نئے طبقے بڑی آسانی سے اپنے مفادات حاصل کر سکتے ہیں۔ کہنے کا مقصد

یہ ہے کہ دونوں طرف سے فرقہ واریت کی فضا اس معنیٰ میں بنی رہتی ہے۔ اور فرقہ پرستوں کو جب بھی اپنے سیاسی یا معاشی مفادات کے لیے ضروری ہو، اس کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ زوال پذیر مسلمانوں میں فرقہ پرستی کی نمائندگی پہلے رضا کاروں نے کی۔ اور بعد میں اس کی جگہ مجلس اتحاد المسلمین نے لے لی۔ چنانچہ آج بھی اتحاد المسلمین غریب اور اَن پڑھ مسلمانوں میں جو پرانے شہر میں رہتے ہیں زیادہ مقبول ہے اور اُبھرتے ہوئے ہندو بورژوا طبقوں کی نمائندگی جن سنگھ اور کچھ حد تک حکمراں کانگریس جماعت نے کی۔ حالیہ فساد میں بھی ایک طرف بی جے پی کا اور دوسری طرف کانگریس آئی کا ہاتھ ہے

یہاں پس منظر کے طور پر ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ جب بائیں بازو کی تحریک ناکام ہو جائے یا کمزور پڑ جائے تو فرقہ پرست طاقتیں کبھی کھل کر اور کبھی سیکیولر جماعت کی شکل میں بڑی جارحیت کا مظاہرہ کرتی ہیں اور اس تحریک کو کچلنے کے لیے پورا زور لگا دیتی ہیں حیدر آباد میں بھی تلنگانہ تحریک کے بعد کچھ ایسے ہی ہوا۔ ہندوستان کے اُبھرتے ہوئے بورژوا طبقے نے اُسے کچلنے پر پورا زور لگا دیا۔ بائیں بازو کی تحریک جتنی کمزور ہوتی گئی، فرقہ پرست طاقتیں اتنی ہی مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ ایسے کئی واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سیکیولر کہی جانیوالی کانگریس نے یا تو خود فرقہ پرستی کا ثبوت دیا یا دوسری فرقہ پرست طاقتوں کی اس سلسلے میں ہمت افزائی کی۔ یہاں ہم اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ تلنگانہ تحریک کے بعد بائیں بازو کی تحریک اس علاقے میں اتنی مضبوط نہیں ہو سکی جبکہ فرقہ پرست تنظیمیں اپنے قدم جماتی چلی گئیں۔

اس پس منظر کے ساتھ اب ہم حالیہ واقعات کی طرف آتے ہیں۔ اس سے ہمیں ان واقعات کو صحیح تناظر میں سمجھنے میں مدد ملے گی۔ تحقیقات کے دوران یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حالیہ فسادات کی اصل ذمے داری بی جے پی — اور ہندو پریشد پر ہے اور ثانوی طور پر مجلس اتحاد المسلمین پر۔ اس سے پہلے بھی جو فساد ہوا تھا اس کا بھی تقریباً یہی (PATTERN) تھا۔ مجلس اتحاد المسلمین کی بنیاد پرانے شہر میں ہے اور یہاں آج بھی غریب مسلمانوں کی بڑی تعداد رہتی ہے۔ پرانے شہر میں بھی مسلمانوں کی آبادی کا تناسب تقریباً ۷۰ فیصد ہے۔ پرانے شہر کی کل آبادی ۱۲ لاکھ ہے جبکہ حیدر آباد کی کل آبادی ۲۶ لاکھ ہے۔ پرانے شہر کے علاقے میں جو ہندو رہتے ہیں ان میں سے اکثر کا تعلق چھوٹے تاجر طبقوں سے ہے جن پر دقیانوسیت اور

مذہب کا اثر کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ بی جے پی اور وشوا ہندو پریشد جیسی احیاء پرست جماعتوں کا (BASE) انہی طبقوں میں ہوتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہر کے اس پرانے علاقے میں بی جے پی اور مجلس اتحاد المسلمین میں سیدھا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ چناؤ کے دوران یہ خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے اور چناؤ سے پہلے اپنے اپنے ووٹروں کو زیر اثر رکھنے کے لیے اس قسم کی فضا بنائے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

حیدر آباد کے فساد میں بی جے پی اور وشوا ہندو پریشد نے منصوبہ بند رول ادا کیا ہے یہ بات یہاں دہرانا ضروری ہے کہ میناکشی پورم میں چند سو ہریجنوں کے قبولِ اسلام کے بعد سے وشو ہندو پریشد نے ملک گیر پیمانے پر اس کے خلاف بڑی جارحانہ تحریک شروع کی اور اس واقعے کے بعد جتنے بڑے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان میں براہِ راست وشو ہندو پریشد کا ہاتھ رہا ہے۔ حیدر آباد کا فساد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ واقعات اس کی گواہی دیتے ہیں۔

وشو ہندو پریشد نے اپنی ملک گیر مہم کے دوران ہندو اتحاد پر خاص طور سے زور دیا تھا۔ اور ہر بڑے شہر میں "ہندو متحد ہوں" "ہم ہندو ہیں اور ہمیں اس پر فخر ہے" قسم کے نعرے دیواروں پر لکھوائے تھے۔ لیکن حیدر آباد میں یہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کچھ علاقوں میں بڑے بڑے بینر (BANNER) لگوائے ہیں جن پر لکھا گیا ہے کہ "نگر کولی قرارداد پر عمل کرو، ہندوستان کو ہندو اسٹیٹ بناؤ" یہ کتنا خطرناک نعرہ ہے اس کا ہم اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ بینر کسی تنظیم کے نام سے نہیں لگائے گئے ہیں لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ پولیس نے نہ تو یہ بینر ہٹائے ہیں اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی کے خلاف کوئی کارروائی ہی کی ہے۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ خود وزیر اعلیٰ نے، ایک رپورٹ کے مطابق، اس معاملے میں اپنی بے یارو مددگاری کا اظہار کیا اور اس علاقے سے گذرتے ہوئے ایک بینر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں پولیس سے اُسے ہٹانے کے لیے کہوں تو پولیس میری بات نہیں سنے گی اس لیے میں عام لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ ہندو مسلم اتحاد کا ثبوت دیجئے اور ان بینروں کو ہٹا دیجئے۔ ایسے بینروں سے جس قسم کی فضا شہر میں پیدا ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہم اچھی طرح کر سکتے ہیں۔

حالیہ فساد کے سلسلے میں جو سب سے پہلا سنگین واقعہ پیش آیا وہ آلوین (ALLWYN)

فیکٹری کے کمپاؤنڈ میں ایک مسجد کے سلسلے میں تھا، اس فیکٹری کے کمپاؤنڈ میں ایک قدیم مزار ہے جس کے آس پاس بعد میں مسجد تعمیر کردی گئی کیونکہ اس فیکٹری میں بڑی تعداد مسلم مزدوروں کی تھی۔ یہاں پہلے اِنٹوک کی یونین تھی لیکن دھیرے دھیرے یہ یونین بی۔ جے۔ پی کے ہاتھ میں آگئی اور پنڈت نریندر اس کا لیڈر چنا گیا۔ مسجد کی تعمیر کے بعد ہی اس کے متعلق جھگڑا کھڑا کیا اور معاملہ سپریم کورٹ تک گیا۔ سپریم کورٹ نے فیصلہ مسجد کے حق میں کیا اور ۷ ایکڑ زمین اور ایک عمارت مسجد کے ٹرسٹیوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ صادر کیا اور اس فیصلے پر فیکٹری کے انتظامیہ نے عمل نہیں کیا تھا۔ ۸ ستمبر ۱۹۸۳ء کو نریندر کی سازباز سے مسجد میں مورتی رکھوادی اور دیوتاؤں کی تصویریں آویزاں کرادیں۔ قرآن مجید کی کاپیاں باہر حوض میں پھینک دی گئیں۔

جیسے ہی یہ خبر پھیلی مجلس اتحاد المسلمین نے حیدرآباد بندھ کا فیصلہ کر کے اعلان کردیا۔ ٹی۔ این راما راؤ کو یہ خبر ملتے ہی انھوں نے اتحاد المسلمین کے لیڈروں کو بلایا اور یقین دلایا کہ وہ مسجد کے نقصان کی تلافی کریں گے اور عام مسلمانوں کے لیے اسے کھول دیں گے۔ اور مسجد کے لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ بندھ کا اعلان واپس لے لیں تاکہ فضا مکدر نہ ہو۔ مسجد کے لیڈروں نے وزیراعلیٰ کی یہ بات مان بھی لی۔ لیکن باوثوق ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ بعد میں کانگریس آئی کہ کچھ عناصر نے مجلس کے لیڈروں کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ بندھ کا اعلان واپس نہ لیں۔ شاید کانگریس آئی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں میں کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یاد رہے کہ پچھلے چناؤ میں آندھرا پردیش کے مسلمانوں نے راما راؤ کی پارٹی تلگو دیسم کو بڑی تعداد میں ووٹ دیئے تھے۔ مجلس نے اس طرح وزیراعلیٰ سے وعدہ کرنے کے باوجود بندھ کا اعلان واپس نہیں لیا۔ اور ۹ ستمبر کو بندھ کروایا گیا۔ اس سے شہر کی فضا میں فرقہ وارانہ تناؤ اور بڑھ گیا۔ مجلس کے بعض حامیوں نے ۹ ستمبر کو دن کے ۱۱ بجے کے بعد زبردستی دوکانیں بند کرانے کی کوشش کی اور کچھ پُرتشدد واقعات بھی پیش آئے۔ اسی دن ایک بڑا المناک واقعہ پولیس کی زیادتی کی وجہ سے پیش آیا۔ دو بچے نعیم اور شکیل کالج سے لوٹ رہے تھے۔ شکیل کی عمر ۲۰ سال اور نعیم کی عمر ۱۶ سال بتائی جاتی ہے۔ دونوں ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھے جن پر عربی میں کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ وہاں سے پولیس جیپ نکلی جا رہی تھی۔ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ خود پولیس انسپکٹر نے

ان دونوں پر گولیاں داغیں اور دونوں طالبعلم وہیں جاں بحق ہوگئے۔

اس سے قبل چار مینار کے علاقے میں جس کا نیا نام اب بھاگیہ نگر ہے ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ چار مینار سے قریب ہی ۱۹۶۵ء میں ایک پتھر پر گیرو لگا کر اسے مورتی کا روپ دیدیا گیا۔ اور ایک بوڑھی عورت کو وہاں محافظ کے طور پر بٹھادیا گیا۔ اس مندر کا نام بھاگیہ لکشمی مندر رکھا گیا۔ چار مینار کے آس پاس ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی ہے اور شہر کی جامع مسجد بھی مینار کے قریب ہی واقع ہے۔ ۱۹۷۰ء میں یہاں ایک واقعہ پیش آیا تھا RTC کی ایک بس جس کا ڈرائیور ایک مسلمان تھا مندر کے اس پتھر سے ٹکرا گئی۔ ڈرائیور کو ہندوؤں کے احتجاج پر نوکری سے برطرف کرایا گیا۔ اور وہاں راتوں رات ایک پکا مندر تعمیر کر دیا گیا۔ اور ایک پجاری مقرر کر دیا گیا۔ ۷ ستمبر ۱۹۸۳ء کو جامع مسجد سے نماز پڑھکر نکلتے ہوئے ایک شخص نے اس مندر پر پتھر مارا۔ پجاری نے احتجاج کیا تو اس کی بھی پٹائی کر دی، پولیس سے بھی ہاتھا پائی ہوئی اور بالآخر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اور اب تک پولیس کی حراست میں ہے۔ پولیس نے اپنے ایک اخباری بیان میں اسے پاگل قرار دیا ہے۔ دراصل حالیہ فساد کی ابتدا اسی واقعے سے ہوتی ہے۔

اس واقعے کے بعد اور خصوصاً ۹ ستمبر کے بندھ کے بعد پرانے شہر میں چھرے بازی کے واقعات پیش آنے لگے۔ پرانے حیدر آباد شہر میں تنگ گلیاں ہیں۔ ایسی گلیوں میں چھرا مارنے کے بعد غائب ہو جانا بڑا آسان ہوتا ہے۔ حیدر آباد شہر کی اس خصوصیت کی بنا پر فساد میں ہلاکین کی تعداد زیادہ تر چھرے بازی کے واقعات سے سرکاری اعداد کے مطابق ۴۰ سے اوپر پہنچ چکی ہے۔ اور غیر سرکاری اعداد کے مطابق ۷۰ سے زیادہ اور زخمیوں کی تعداد ۱۵۰ سے زائد۔ یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ حیدر آباد کے فسادات کا پیٹرن دوسرے شہروں کے فسادات سے مختلف رہا ہے۔ پچھلے دہے میں مختلف شہروں میں جتنے فسادات ہوئے ہیں۔ اس میں زیادہ تر لوگ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے ہیں اور ان فسادات میں افواہوں کا بھی خاص رول رہا ہے۔

لیکن ہمیں حیدر آباد کے فسادات میں، جیسا کہ کچھ آگے چل کر بھی ظاہر ہوگا، پولیس کی

بے عملی ضرور نظر آتی ہے لیکن بے گناہ عوام کو بے رحمی سے مارنے کی مثال نہیں ملتی۔ حیدر آباد میں زیادہ تر لوگ آپس میں چاقو بازی کا شکار ہوئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو پرانے شہر کی تنگ گلیاں ہیں جہاں چھرے باز حملہ کر کے آسانی سے غائب ہو سکتا ہے اور دوسری وجہ چھرے بازی کی پرانی روایت ہے جو نظام کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ خود نظام کے ذاتی حفاظتی دستے کے لوگ ماہر چھرے باز ہوتے تھے۔

چھرے بازی کے واقعات ۹ ستمبر سے ہی شروع ہو گئے تھے لیکن ان واقعات میں ۲۱ ستمبر کے بعد اور تیزی آگئی جو گنپتی وسرجن کا دن تھا۔ حیدر آباد میں ۱۹۷۸ء سے پہلے گنپتی کا تہوار اتنی دھوم دھام سے نہیں منایا جاتا تھا۔ اس کی شروعات دراصل ۱۹۷۸ء سے ہوئی جب مرکز میں جنتا حکومت تھی۔ اس تہوار کو اتنے بڑے پیمانہ پر شروع کرنے کی ذمے داری چنا ریڈی پر ہے جو اس زمانے میں چیف منسٹر تھے۔ خود چیف منسٹر نے وسرجن کے جلوس میں شرکت کی اور تب سے یہ روایت بن گئی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ملک میں سیاسی اور معاشی بحران جتنا گہرا ہوتا چلا جاتا ہے، حکمراں طبقہ مذہبی دقیانوسیت کو اتنی ہی زیادہ ہوا دیتا ہے۔ مارکس نے اپنے ایک مضمون " (ON THE JEWISH QUESTION) اسے حکمراں طبقے کے " مذہب کی طرف سیاسی رجحان " (POLITICAL ATTITUDE TO RELIGION) کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی دور میں تعلیم بالغان کے لیے رہائشی اسکول کھولنے کے لیے ۴ کروڑ روپے منظور کیے گئے۔ حیدر آباد اور اس کے اطراف میں ۱۵ اسکول کھولے گئے جو اب RSS کی ٹریننگ کا گڑھ بنے ہوئے ہیں۔ دو ہزار سے زیادہ آر ایس ایس کے افراد کی آج ان اسکولوں میں تربیت ہو رہی ہے۔

ہر سال گنیش اُتسو بڑھ چڑھ کر منایا جاتا ہے۔ اس سال بھی اس کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ وشو ہندو پریشد، آر ایس ایس، بی جے پی، آریہ سماج وغیرہ جیسی سبھی تنظیمیں اس میں شامل تھیں، ایک بہت بڑا پنڈال اس موقع پر بنایا گیا تھا اور اسٹیج کے پس منظر میں بہت بڑا بینر لگا ہوا تھا جس پر بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہوا تھا " نگر کونسل کی قرارداد منظور کرو، ہندوستان کو ہندو راج ظاہر کرو۔" ہر سال کی طرح وزیر اعلیٰ این ٹی راما راؤ نے اس میں

شرکت کی لیکن ان کی تقریر یں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا تھا۔ جب راما راؤ نے ہندو مسلم بھائی بھائی کی بات کہی تو مجمع میں سے حاضرین نے " ہندو ہندو بھائی بھائی " کے نعرے لگائے۔ اسٹیج پر وشو ہندو پریشد کے صدر مہاراجہ میواڑ، حیدر آباد کے آریہ سماجی لیڈر وندے ماترم راچندر اور بی جے پی لیڈر نریندر موجود تھے۔ مجمع میں سبھی زعفرانی رنگ کی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور مہارانہ میواڑ نے وزیر اعلیٰ کو بھی زعفرانی ٹوپی پیش کی جسے پہلے انھوں نے پہننے سے انکار کیا لیکن اصرار کرنے پر انھوں نے تھوڑی دیر کے لیے پہن لی۔ اس میٹنگ میں ہندو لیڈروں نے ہندوؤں کی حفاظت اور ہندو راج کی بات بار بار دھرائی۔

ہر سال جلوس ایک مقررہ راستے سے گذرتا ہے۔ اس راستے پر تمام ہندو گھروں پر پہلے سے بھگوے جھنڈے لگا دیئے گئے تھے تاکہ ہندوؤں کے مکانات کی نشان دہی ہو سکے جلوس میں تقریباً ۲۲ ٹرک شامل تھے جن میں کئی ٹرکوں میں لاٹھیاں وغیرہ رکھی گئی تھیں۔ وسرجن کے بعد لوٹتے وقت جلوس مقررہ راستوں کو چھوڑ کر مسلم علاقوں سے گذرا اور لوٹ مار شروع کر دی پولیس نے کوئی روک تھام نہیں کی اور خاموش تماشائی بنی رہی۔ پہلے وسرجن موسیٰ ندی میں ہوتا تھا لیکن اب حسین ساگر میں ہونے لگا ہے جس کا نام اب بدل کر ونایک ساگر کر دیا گیا ہے۔ اسی تالاب سے شہر کو پینے کا پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ اور ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر اسی طرح اس میں مورتیاں غرق کی جاتی رہیں تو اس تالاب کا پانی کچھ عرصے میں پینے کے قابل نہیں رہے گا۔

اسی طرح چند سالوں پہلے سے مجلس اتحاد المسلمین نے پنکھا جلوس اور ماہِ رمضان المبارک میں "قرآن ڈے" منانے کا آغاز کیا تھا۔ اس میں لاکھوں مسلمان شرکت کرتے ہیں۔ دونوں طرف سے بڑے زور شور سے مذہبی تہوار منائے جا رہے ہیں اور ان کا بنیادی مقصد مذہبی نہیں سیاسی ہوتا ہے۔ آج ہمارے ملک میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے اور معاشی مسائل کی جانب سے توجہ ہٹانے کے لیے بہت بڑے پیمانے پر مذہب اور مذہبی تہواروں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ مذہب کی طرف سیاسی رجحان ہے یا سیاست کی طرف مذہبی رُجحان؟

(اکتوبر ۱۹۸۳ء)

خالصتان کا مسئلہ اور ہندوستانی مسلمان

آج کل ہندوستان میں سکھ سیاست کے بڑے چرچے ہیں۔ روزانہ اخباروں میں سکھ انتہا پسندوں کی طرف سے کئے جانے والے قتل وخون یا ہوائی جہازوں کے اغوا وغیرہ کے متعلق سرخیاں لگائی جاتی ہیں۔ اور اداریئے تحریر کئے جاتے ہیں۔ سکھ سیاست نے ہندوستان میں آج جو رُخ اختیار کیا ہے اس سے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان کی سیاست پر دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ سکھ سیاست کی روشنی میں مسلمانوں کے مسائل کا تجزیہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ہندوستان میں سکھ بھی اقلیت میں ہیں اور مسلمان بھی حالانکہ سکھوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

جو مسائل کی پیچیدگیوں اور سیاست کے زیر وبم سے کما حقہٗ واقف نہیں ہوتے وہ مسلمانوں کا مقابلہ عام طور پر پارسیوں اور سکھوں سے کر کے یہ کہا کرتے ہیں کہ پارسی اور سکھ ملک کے وفادار ہیں، نہ وہ ملک کی اکثریت سے لڑتے ہیں، نہ ہی اُن کے مذہب سے نفرت کرتے ہیں۔ اور نہ ہی ان اقلیتوں سے ہندوؤں کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اگر مسلمان بھی پارسیوں اور سکھوں کی طرح برتاؤ کرنے لگیں تو ہندو مسلم فساد کی نوبت ہی نہ آئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں یہ بڑی ہی طفلانہ منطق ہے۔

سارے ہندوستان میں کل ملاکر پارسیوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے بھی کم ہے۔ اتنی چھوٹی سی اقلیت نہ کبھی کسی کی راہ میں حائل ہوسکتی ہے نہ اس کے مسائل ملک کے لیے کسی معنی میں گمبھیر چیلنج کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ نہ ہی اس کا ووٹنگ پاور کسی سیاسی جماعت کو نقصان یا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۱۰ کروڑ ہے، ان کے مسائل بڑے پیچیدہ اور

ان کا ووٹنگ پاور سیاسی جماعتوں کی تقدیر کو بنا بگاڑ سکتا ہے۔ بڑی اقلیت کے مسائل بھی بڑے ہوتے ہیں۔ اور ان کا حل ملک کے لیے زبردست چیلنج بن جاتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تصادم انہی مسائل اور ان سے پیدا ہونے والی سیاست کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ مذہب کی بنیاد پر۔ اس تصادم کی جڑیں ہمیں انہی مسائل اور سیاسی اقتدار کی جنگ میں تلاش کرنی چاہیئے۔

سکھوں کے مسئلے نے جو رخ اختیار کیا ہے اس سے یہ بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے۔ سکھوں کو "مثالی اقلیت" قرار دیا جاتا تھا۔ اور انھیں نہ صرف ملک کے لیے نہایت وفادار بلکہ ہندو سماج کا ایک جزو ہی سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف سکھوں اور نرنکاریوں بلکہ سکھوں اور ہندوؤں میں بھی زبردست تصادم پیدا ہو گیا ہے اور آج پنجاب کے امن کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ایسا کیا اچانک ہو گیا؟ کیا اچانک سکھوں کا رویہ کچھ پراسرار وجوہات کی بناء پر بدل گیا؟ حقیقت میں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ سیاسیات اور سماجیات کے عالم کے لیے اس میں نہ کوئی پراسراریت ہے نہ ہی کوئی ناقابل فہم راز۔ آیئے پہلے ہم سکھوں کی سیاست اور ان کے رویئے میں پیدا شدہ تبدیلی کی وجوہات پر غور کریں اور پھر اس کا مقابلہ ہم مسلمانوں کے مسائل اور ان کی سیاست سے کریں۔

کسی بھی مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس کی سماجی اور معاشی جڑوں کو تلاش کرنا بے حد ضروری ہے۔ اور ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آج کا سماج کوئی ٹھہری ہوئی اکائی نہیں ہے۔ معاشی اور پیداواری قوتوں کی ترقی کے ساتھ (حالانکہ اس ترقی کی رفتار ہمارے ملک میں خاصی مدھم ہے) ہمارا سماج ایک تبدیلی کے عمل سے گذر رہا ہے۔ اور جب سماج حرکت میں ہو تو نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان مسائل کا اثر بدلتے ہوئے سماج کی سیاست پر بھی پڑتا ہے۔ ان مسائل کی نوعیت اکثر معاشی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں سکھوں کی بڑی بھاری اکثریت پنجابی صوبے میں آباد ہے۔ ان میں سے اکثر دیہاتوں میں کھیتی باڑی کرتے ہیں اور شہروں میں چھوٹی بڑی صنعت سے وابستہ ہیں۔ پنجاب شروع سے آبپاشی نظام اور زراعتی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ سبز انقلاب (گرین ریولیوشن) کا بھی گیہوں کی پیداوار

میں سب سے زیادہ فائدہ پنجاب کو ہی پہنچا تھا۔ سابق وزیرِ اعلیٰ کیرو ؔ[illegible] نے پنجاب کے شہروں میں بھی چھوٹی صنعتوں نے کافی ترقی کی ہے۔ گویا یہ کہنا چاہیئے کہ دیہی پنجاب میں بھی اور شہری پنجاب میں بھی۔ آزادی کے بعد پنجاب میں ایک خوشحال بورژوا دیہی بورژوا طبقہ پیدا ہوا۔ اس طبقے کی اپنی تمنائیں اور سیاسی ارمان ہیں اور زیادہ معاشی ترقی کی زبردست خواہش بھی۔

اس خواہش نے پنجابی صوبے کی مانگ کی صورت اختیار کی ہے۔ پنجابی زبان کے کچھ علاقے ہریانہ میں شامل کر دیئے گئے ہیں اور چنڈی گڑھ کا مسئلہ بھی ابھی طے نہیں ہو پایا ہے۔ دوسری طرف پنجاب میں الکٹرک پاور کی بھی سخت کمی محسوس کی جارہی ہے جس سے ایک طرف چھوٹی صنعتوں کی پیداوار کی ترقی پر اثر پڑ رہا ہے۔ اور دوسری طرف دیہاتوں میں زرعی پیداوار پر بھی۔ ظاہر ہے اس سے سکھ بورژوازی میں غم و غصے کی لہر پیدا ہوئی ہے اور وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ مرکزی حکومت ان کے مسائل کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہی ہے۔ اکالی لیڈروں نے جو چالیس مانگیں حکومت کے سامنے رکھی ہیں اُن کا لُبِّ لباب بھی یہی ہے۔ ۱ اکتوبر کو چنڈی گڑھ میں سکھ دانشوروں کی جو میٹنگ ہوئی تھی اس میں بھی فرقہ وارانہ تناؤ کو کم کرنے کے لیے کم و بیش انہی باتوں پر زور دیا گیا۔ بعض سکھ دانشوروں نے یہ بات صاف لفظوں میں کہی کہ فرقہ وارانہ تناؤ کم کرنے کے لیے پنجاب کے معاشی مسائل کا حل تلاش کرنا اور معاشی خوشحالی کو پھیلانا بے حد ضروری ہے۔

اس بات کو بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگر پنجابی صوبے کی مانگ پہلے ہی پوری ہو جاتی اور مرکزی سرکار نے ہریانہ، ہماچل پردیش اور راجستھان میں شامل پنجابی زبان بولنے والے علاقوں کا حل تلاش کر لیا ہوتا اور دوسری طرف تھائن ڈیم کا مسئلہ، بھاکڑا ڈیم پر پنجاب کی حکومت کے مؤثر کنٹرول کے سوال اور برقی قوت کے پیداوار میں اضافے کی مانگ پر توجہ دی ہوتی تو سکھ انتہا پسندوں کو خالصتان کا خود مختار علاقہ بنانے کی مانگ کرنے کا موقع نہ ملتا۔ ہمیں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ سماجی اور معاشی اعتبار سے پچھڑے ہوئے ملک میں سیاسی اور معاشی مانگوں کو منوانے کے لیے بھی مذہب کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے

عام طور پر یہ تأثر پیدا ہونے لگتا ہے کہ اصل مسئلہ معاشی اور سیاسی نہیں بلکہ مذہبی ہے۔ سکھوں کے معاملے میں بھی آج یہی ہو رہا ہے۔ اکالی رہنما اور خالصتان کے انتہا پسند حامی مذہبی زبان استعمال کر رہے ہیں حالانکہ مقصد مندرجہ بالا سیکیولر مانگوں کا ہے۔

مذہبی محاورے استعمال کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اس سے بڑے طاقت ور جذبات پیدا ہوتے ہیں اور ان جذبات کا اپنا (MOMENTUM) (حرکت پیدا کرنے والا اثر) ہوتا ہے جس کا اظہار اکثر مذہبی جنون کی شکل میں ہونے لگتا ہے اور بعض سیاستداں ایسے حالات میں اپنے حریف پر بازی لے جانے کے لیے اس جنون کو اور ہوا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ منصوبہ بند تشدد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ آج پنجاب میں سکھ سیاست یہی صورت اختیار کر رہی ہے۔ خالصتان کے حامی چند سر پھرے نوجوان دن دہاڑے اپنے مخالفوں پر گولیاں چلا رہے ہیں اور اکالی لیڈر سکھ عوام میں اپنی مقبولیت گنوا بیٹھنے کے ڈر سے ان حرکتوں کی مذمت کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ آخر مذہب کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ آج سکھوں کا دانشور طبقہ بھی اپنی علیحدہ مذہبی شناخت منوانے پر مُصر ہے۔

سکھوں کے مقابلے میں مسلمان معاشی طور پر بہت پچھڑا ہوا ہے۔ اس نے نہ چھوٹی بڑی صنعتوں میں ترقی کی ہے نہ ہی زرعی پیداوار میں۔ مسلمانوں میں تجارت پیشہ طبقہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مغربی ہندوستان اور جنوب میں مسلمانوں کے کچھ مذہبی فرقے تجارت پیشہ ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ معاشی طور پر پچھڑے ہوئے ہونے کی وجہ سے اُن میں اعلیٰ تعلیم کی بھی خاص کمی ہے اس لیے سرکاری نوکریوں کے دروازے بھی اُن پر بند ہیں۔ جہاں سکھوں میں صنعتی اور زراعتی ترقی کی رفتار کم ہو جانے کی وجہ سے غم و غصہ پیدا ہو رہا ہے وہاں مسلمانوں میں یہ مواقع ہی فراہم نہیں ہیں۔ اس صورت میں ان کے مسائل اور فرسٹریشن (مایوسی) کا اندازہ لیا جا سکتا ہے۔ جہاں ترقی اور طاقت کا غرور انسان کو تشدد کی طرف لے جاتا ہے وہاں ناتوانی اور فرسٹریشن بھی تشدد کا رُجحان پیدا کرتا ہے۔

مسلمان آج ہندوستان میں ایک بُحرانی دور سے گذر رہے ہیں۔ ان کے مسائل پر نہ حکومت غور کرتی ہے نہ خود مسلمانوں کے لیڈر۔ بعض مسلمان لیڈر اکالیوں کی طرح سیاست

میں مذہب کا نعرہ بلند کرکے اس صورتِ حال کو اور نازک بنا دیتے ہیں، لیکن مسلمانوں پر بڑی جلدی "مذہبی جنون" (فناٹزم) کا لیبل لگ جاتا ہے۔ آج سکھ سیاست نے جو رُخ اختیار کیا ہے اس سے مسلمانوں کے برتاؤ پر نہ صرف نئی روشنی پڑ رہی ہے بلکہ اب ہماری سمجھ میں یہ بات آسانی سے آسکتی ہے کہ بعض حالات میں مذہب اور سیاست کا کیا رول ہوتا ہے۔ مذہبی جنون صرف مذہب کی پیداوار نہیں ہوتا، خاص سماجی اور معاشی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ جو لوگ اس بات کو نہیں سمجھ پاتے وہ بڑی آسانی سے مسلمانوں پر "مذہبی جنون" کا لیبل لگا دیتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کی خاصیت ہے۔ اچھے سمجھدار لوگ اس قسم کے سطحی پروپیگنڈہ کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ہندوازم اور ہندو لبرل ہے اور اسلام اور مسلمان مذہبی جنون کے شکار۔

یہ فیصلہ صادر کرنے والے آج سکھوں کے متعلق کیا کہیں گے؟ آج کیوں سکھ اپنے اس "مذہبی جنون" کا اظہار کر رہے ہیں۔ جب کہ آج تک ہم پر سکھوں کے مزاج کا تاثر "کھا پی کر خوش رہنے والوں" کا سا تھا۔؟ آج سکھ دانشور بھی اپنی علیحدہ مذہبی شناخت پر کیوں اصرار کر رہے ہیں؟ مسلمانوں نے جب بھی اپنی علیحدہ مذہبی شناخت پر زور دیا تو انہیں نہ صرف مذہبی جنون کا الزام دیا گیا بلکہ ملک کی طرف ان کی وفاداری بھی مشکوک سمجھی گئی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ سکھوں اور مسلمانوں کو اپنی علیحدہ شناخت مذہب کی بنیاد پر قائم کرنا ہی چاہیئے۔ میں صرف اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ ہم ان سوالوں کو سماجی اور معاشی حالات کی روشنی میں ہی ٹھیک طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔

ہم نے ہر بات کو سمجھنے کے لیے کچھ (STEREO TYPES: سانچے) بنا رکھے ہیں اور انہی سانچوں میں فٹ کرکے ہم ان باتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ لیکن تیزی سے بدلتے ہوئے سماج میں ان جامد سانچوں کی مدد سے ہم ان مسائل کو ہرگز نہیں سمجھ سکیں گے۔ بدلتے ہوئے حالات میں ہمیں اپنے ان تصورات میں بھی تبدیلی کرنی ہوگی۔ بنیادی طور پر نہ سکھ مذہبی اعتبار سے جنونی ہے نہ ہی عام مسلمان۔ بعض حالات میں مذہبی جنون اور علیحدہ مذہبی شناخت کا میلان پیدا ہو جاتا ہے جسے بعض مفاد پرست عناصر اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ہوا دیتے ہیں

خالصتان کے لیڈر آج بھی کر رہے ہیں۔ اور ملک کی تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کے لیڈروں نے یہی کیا تھا اور بعض مسلمان لیڈر آج بھی سیاسی اقتدار کی سودے بازی کرنے کے لیے ایسا کرتے رہتے ہیں۔ آج جہاں پنجابی صوبے اور سکھوں کے مسائل کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے وہاں مسلمانوں کے سماجی اور معاشی مسائل حل کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے ورنہ ان میں بھی مذہبی انتہاپسندی اور علیحدہ شناخت کا رجحان بڑھ سکتا ہے۔ عام مسلمان بھی ہندوستان کے دوسرے عوام کی طرح اپنے مسائل کا حل چاہتا ہے اور اس کے بنیادی مسائل بھی معاشی اور سماجی نوعیت کے ہی ہیں۔ جتنی ہی ان مسائل پر حکومت کی توجہ کم ہوتی جائے گی، مذہبی انتہاپسندی کا رجحان بڑھتا جائے گا۔ اور اس سے فائدہ اٹھانے والے موقع پرست لیڈروں کا اثر بھی۔ اکالی لیڈروں کا آج سکھ سیاست میں رول اس کی قطعی نشاندہی کر رہا ہے۔

تبدیلیٔ مذہب۔ اسباب و نتائج

آج کل ایک عرصہ سے ہمارے ملک میں ہریجنوں کے تبدیلیٔ مذہب پر ایک ہنگامہ برپا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہنگامہ واقعی تبدیلیٔ مذہب کے خلاف ہے یا اس کے کچھ اور اسباب ہیں اور یہ تبدیلیٔ مذہب واقعی تبدیلیٔ مذہب ہے یا یہ کسی اور سماجی مظہر کا اظہار ہے؟ تبدیلیٔ مذہب کے ہندوستانی مسلمانوں پر کیا نتائج مرتب ہوں گے؟ یہ سوالات بڑے بنیادی اور اہم سوالات ہیں۔ اور تبدیلیٔ مذہب جیسے اہم واقعہ کو سمجھنے میں یہ بڑے مددگار اور مفید ثابت ہوں گے۔ آیئے ہم ان سوالات کی روشنی میں اس واقعے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

دراصل یہ ہنگامہ تبدیلیٔ مذہب کے خلاف نہیں ہے، اس ہنگامے کے اسباب بنیادی طور پر سیاسی ہیں۔ برِ صغیر ہندوستان و پاکستان میں اسلام کا رول محض مذہبی ہی نہیں سیاسی بھی ہے اور مہاتما گاندھی کی بیسویں صدی کے اوائل میں تحریک خلافت سے وابستگی اسی بات کا اعتراف تھا۔ اگر تبدیلیٔ مذہب ہی بنیادی مسئلہ ہوتا تو سب سے بڑا ہنگامہ اُس وقت ہونا چاہیئے تھا جب کہ اس صدی کی پانچویں دہائی کے آخر میں بابا صاحب امبیڈکر لاکھوں ہریجنوں کے ساتھ بدھ مذہب میں داخل ہوئے تھے۔ دراصل، ڈاکٹر امبیڈکر نے سب سے پہلے مذہب اسلام اختیار کرنے کے معاملے پر غور کیا تھا۔ اور کئی سال تک اس پر غور کرتے رہے تبدیلیٔ مذہب کی تجویز بابا صاحب کے سامنے آزادیٔ وطن سے پہلے سے تھی اور انہیں فیصلہ کرنے میں کئی سال لگ گئے۔

آر ایس ایس کے سربراہ شری گورو گولوالکر کو جب اس بات کا علم ہوا کہ ڈاکٹر امبیڈکر کے

سامنے اسلام قبول کرنے کی بھی تجویز ہے تو وہ بے حد پریشان ہوئے اور اس کوشش میں لگ گئے کہ وہ اس تجویز پر غور نہ کریں اور خود گرو گولوالکر نے باباصاحب کے سامنے دو متبادل تجویزیں رکھیں کہ وہ یا تو سکھ مذہب اختیار کرلیں یا بدھ مذہب۔ آخر برسوں کے غور و خوض کے بعد امبیڈکر نے فیصلہ بدھ مت کے حق میں کیا۔ اور اس تبدیلیٔ مذہب پر ملک میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ اگر امبیڈکر کا فیصلہ اسلام کے حق میں ہوتا تو گرو گولوالکر صاحب کیا کچھ نہ کرتے اس کا اندازہ ہم آج کے ہنگامے سے کرسکتے ہیں جو میناکشی پورم میں صرف ۱۵۰۰ ہریجنوں کے قبولِ اسلام پر ملک میں برپا کیا جارہا ہے۔

اسلام جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ہندوستان میں بڑی اہم سیاسی نوعیت کا مالک ہے۔ اور مسلمانوں کی تعداد اس ملک کی سیاسی مساوات (POLITICAL EQUATION) توازن کو اثر انداز کرتی ہے۔ آر ایس ایس جیسی دائیں بازو کی جماعت ہرگز یہ نہیں چاہے گی کہ کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کے سیاسی اثر و رسوخ میں اضافہ ہو۔ ہندوستان میں ہی نہیں ہر ملک میں بڑی اقلیت اور اکثریت میں ہمیشہ محبت و نفرت کا رشتہ (LOVE-HATE RELATION) پایا جاتا ہے۔ محبت ملک کی سالمیت اور یکجہتی کے لیے ضروری ہوتی ہے اور نفرت اس لاشعوری اور شعوری رجحان کا اظہار ہوتی ہے کہ کہیں اقلیت کا سیاسی وزن بڑھ نہ جائے۔ اور انہیں زیادہ مراعات حاصل نہ ہوجائیں۔ لبرل اور بائیں بازو کی جماعتیں اقلیتوں کی طرف اکثر محبت کا اور منصفانہ رویہ اختیار کرتی ہیں تاکہ ایک سیکیولر اور عادلانہ معاشرہ قائم ہوسکے اور دائیں بازو کی انتہا پسند جماعتیں ان کی طرف نفرت کا اور دشمنانہ رویہ اختیار کرتی ہیں تاکہ ملک اور سماج کے بنیادی مسائل سے توجہ ہٹا کر ہر برائی کا نشانہ اقلیت کو بنایا جاسکے۔ جرمن کے نازی ہوں یا امریکہ کے کوکلکس کلاں (KU KLUX KLAN) برطانیہ کے نسل پرست ہوں یا ہندوستان کے آر ایس ایس کے اراکین، ان کا اپنی اپنی اقلیتوں کی طرف تقریباً ایک جیسا ہی رویہ ہوتا ہے۔ نہ یہ اقلیتوں کی تعداد میں اضافے کو برداشت کرسکتے ہیں نہ ہی ان کے حقوق و مراعات میں۔

تبدیلیٔ مذہب کے موجودہ ہنگامے کو بھی ہمیں اسی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ بنیادی طور پر

یہ ہنگامہ آر ایس ایس، آریہ سماج اور ان کے زیر اثر ملک کے بڑے اخباروں کا برپا کیا ہوا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ دوسرے سیاست دانوں نے اپنے اپنے طور پر اس کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ آر ایس ایس نے خاص طور سے اسے ہوا دی ہے جس کی ایک وجہ بڑی اہم ہے تبدیلیٔ مذہب کا یہ واقعہ جنوبی ہندوستان میں میناکشی پورم میں پیش آیا ہے اور جنوبی ہندوستان میں (بنگلور وغیرہ کو چھوڑ کر) آر ایس ایس کا اثر شمالی ہندوستان اور مہاراشٹر وغیرہ کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ آر ایس ایس کے لیڈروں نے چند سو ہریجنوں کے تبدیلیٔ مذہب کا فائدہ اٹھا کر اونچی ذات کے ہندوؤں میں خوف و دہشت کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کر کے جنوبی ہندوستان میں خصوصًا اور دوسرے علاقوں میں عمومًا ان کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر بڑے بڑے اخباروں میں با اثر صحافی کم و بیش آر ایس ایس کے نظریے سے متأثر ہوتے ہیں اور انھوں نے بڑی بڑی سرخیاں لگا کر اس واقعے کو اس کی اہمیت اور تناسب سے زیادہ اچھالا تاکہ ہریجنوں کے قبولِ اسلام کے خلاف ملک میں زبردست رائے عامہ تیار ہو جائے اور اس کی ابتدائی مرحلے میں ہی روک تھام کر دی جائے۔

آر ایس ایس کا ہریجنوں کے قبول اسلام کی طرف جو رویہ ہے وہ آر ایس ایس کے ایک اہم لیڈر ناناجی دیش مکھ کے اس مضمون سے ہوتا ہے جو انڈین اکسپریس کے ۱۳ ستمبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ مضمون نہایت سطحی ہے لیکن اس معنیٰ میں اہم ہے کہ آر ایس ایس کے رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔ حقیقت و صداقت کے تمام معیاروں کو نظر انداز کرتے ہوئے موصوف اس مضمون میں رقم طراز ہیں: "(ہریجنوں کے قبول اسلام سے) اگر جارحانہ تبلیغی اسلامک بلاک انتہائی مغربی سرحدوں پر واقع (مراد افریقہ سے ہے) اسلامی ریاست سے لیکر جنوب مشرق میں انڈونیشیا اور ملیشیا تک پھیل جائے تو بین الاقوامی توازن بنیادی طور پر بدل جائے گا۔ اسی طرح ہندوستانی سماج کا پورا تانا بانا اتنا بدل جائے گا کہ پہچان میں بھی نہ آسکے گا اگر ہندوستان کی اکثریت مسلمان ہو جائے۔ یہی تبدیلیٔ مذہب کا آخری مقصد بھی ہے ورنہ کیوں اتنی قوت اور دولت اس پر صرف کی جا رہی ہے۔ اُن کا (مسلمانوں کا) ایک طویل المدت منصوبہ ہے جس کے کئی مراحل ہیں اور پہلا مرحلہ کمزور طبقوں جیسے کہ ہریجنوں

کا مذہب تبدیل کرانا ہے جو اپنی حالت زار پر غصہ کرنے میں حق بجانب ہیں اور اس لیے زیادہ باوقار زندگی، پیسے، تحفوں اور خلیج کے ملکوں میں ملازمت کے خوش آئند وعدوں کے پیش نظر جلد اس کو (تبدیلیٔ مذہب کی دعوت کو) قبول کرنے والے ہیں۔

ناناجی دیش مکھ کی، جو آر ایس ایس کے نمائندہ لیڈر ہیں، ذہنیت کیسے کام کر رہی ہے یہ ہم اوپر کے اقتباس سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ وہ کسی قیمت پر بھی اقلیت کی تعداد میں اضافے کو برداشت نہیں کر سکتے چاہے یہ اضافہ کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو۔ اسی بات کو لیکر مسلمانوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی ناکامی کی کڑی تنقید کی جاتی ہے۔ اس بات کو قطعاً نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ اور ملکوں کا بھی یہی تجربہ ہے کہ معیار زندگی جتنا پست ہوگا خاندانی منصوبہ بندی اتنی ہی ناکام رہے گی۔ چونکہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان معاشی اعتبار سے زیادہ پچھڑا ہوا ہے، اس کے یہاں زیادہ بچے پیدا کرنے کا رُجحان پایا جاتا ہے۔ ہریجنوں اور ہندوؤں کے پس ماندہ طبقوں کا بھی یہی حال ہے۔ جدید ڈیموگرافی یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ عام طور پر اقلیتوں میں اکثریت کے خوف اور بقا کی حکمت عملی کے طور پر اکثر زیادہ بچے پیدا کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

لیکن دائیں بازو کی انتہاپسند جماعتیں کبھی کسی سائنٹفک نظرئے کی قائل نہیں ہوئیں اُن کا مقصد تو مذہبی یا نسلی جذبات کو برانگیختہ کر کے اکثریت کی حمایت حاصل کرنا اور اقتدار کے لیے مذہبی اور نسلی تعصبات وغیرہ کا سہارا لیکر راہ ہموار کرنا ہوتا ہے۔ تبدیلیٔ مذہب کے مسئلے کو بھی اس سازش کے تحت استعمال کیا جا رہا ہے۔

آج اونچی ذات کے ہندو ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اس کشمکش کو ہم موجودہ سماجی نظام اور صنعتی ترقی سے پیدا ہونے والی سماجی تبدیلی کی روشنی میں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ صنعتی ترقی جہاں نئے مسائل پیدا کرتی ہے وہاں سماج کے کمزور طبقوں میں نیا شعور بھی پیدا کرتی ہے۔ آج سے ۲۰، ۲۵ برس پہلے ہریجن اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اتنے جارحانہ طریقے سے اصرار نہیں کرتے تھے اور ذات پات کی لعنت کو خاموش احتجاج کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے لیکن آج اُن میں نیا شعور بیدار ہو چکا ہے اور وہ ذات پات کی لعنت کو ختم کرنے کیلئے

منظم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہریجنوں میں سے کچھ نوجوان پڑھ لکھ کر اپنے سماجی اور سیاسی وقار کو بحال کرنا چاہتے ہیں اور ذات پات کا نظام انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلیے اس لعنت کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکنے کے لیے وہ مختلف طریقے استعمال کر رہے ہیں اور قبول اسلام اس حکمت عملی کا ایک حصہ ہے۔

اونچی ذات کے ہندوؤں کا آج ڈائیلیما ہی یہ ہے کہ وہ ہریجنوں کو برابری کا سماجی درجہ نہیں دے سکتا۔ آخر صدیوں سے وہ انہیں نیچ اور حقیر سمجھتا آیا ہے۔ اور دوسری طرف ان کے جارحانہ احتجاج کو، اور خاص کر اگر وہ قبولیت اسلام کی شکل اختیار کرلے، بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ہندوستانی سماج جوں جوں تبدیلی کے عمل سے دو چار ہوگا، کمزور طبقوں کے احتجاج کی لَے بھی تیز ہو جائے گی۔ ہریجنوں کی نئی تعلیم یافتہ نسل اب توہین آمیز زندگی بسر کرنے کے لیے کسی صورت بھی راضی نہ ہو گی اور کسی تیقّن کی خاطر نہیں بلکہ اونچی ذات کے ہندوؤں کا منہ چڑانے کے لیے اسلام قبول کرے گی یا قبول کرنے کی دھمکی دیتی رہے گی۔

یہاں ہمیں مختصراً تبدیلی مذہب کی ان اسباب کے ساتھ ساتھ نتائج پر بھی غور کر لینا چاہیئے۔ ہریجنوں کو یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام قبول کرکے اُن کا جذبۂ انتقام تو ٹھنڈا ہو سکتا ہے اور شاید وقتی طور پر انہیں سماجی درجے میں بلندی کا احساس بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن آگے چل کر یہ بات محض فریب ثابت ہوگی۔ اسلام میں ذات پات کا کوئی جواز نہ ہونے کے باوجود ہندوستانی مسلم معاشرہ، سماجیات کے ماہر اچھی طرح جانتے ہیں، اس لعنت سے پوری طرح پاک نہیں ہے۔ اشراف اور اجلاف کے فرق سے سب اچھی طرح واقف ہیں حالانکہ اس میں ہندو ذات پات کے نظام کی طرح سختی نہیں ہے۔ اگر کثیر تعداد میں ہریجن مسلمان ہونے لگے تو یہ امتیاز بڑھے گا۔ کم نہیں ہوگا۔ اور نو مسلم اور پیدائشی مسلم میں بھی تناؤ کی صورت وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہے گی۔ اور تبدیلیٔ مذہب سے معاشی صورت حال تو بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دراصل یہ مسئلہ سماجی اور معاشی نوعیت زیادہ رکھتا ہے اور مذہبی نوعیت کم۔ اس مسئلے کا حل منظم جدوجہد کے ذریعے سیاسی سطح پر ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ تبدیلیٔ مذہب کو ہم زیادہ سے زیادہ صدماتی علاج (SHOCK TREATMENT) کہہ سکتے ہیں اور

صدماتی علاج اس مرض کا مستقل علاج ہرگز نہیں ہو سکتا۔

مسلمانوں کے لیے بھی یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ اور خاص طور سے پس ماندہ مسلم عوام کے لیے اگر ہریجنوں کی ایک خاصی تعداد مسلمان ہو بھی گئی (حالانکہ ایسا ہونا ناممکن ہے) تو اس کا فائدہ مسلم مسلمانوں کے اوپری طبقے اور خصوصًا مسلم لیڈرشپ اپنی سیاست کے لیے اٹھائیں گے۔ اور پس ماندہ مسلم عوام کے لیے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہونے کا امکان بڑھتا جائے گا۔

دراصل میناکشی پورم میں تبدیلیٔ مذہب کے واقعے کے بعد ایک زبردست مہم ہندو وشوا پریشد نے چلائی اور جگہ جگہ فسادات پھوٹ پڑے۔

ویسے بھی ہم جانتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فسادات میں غریب عوام ہی تشدد اور لوٹ مار کا شکار ہوتے ہیں۔ چند سو ہریجنوں کے مسلمان ہونے پر جس قسم کا ہنگامہ بپا ہے اس سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر بات آگے بڑھی تو یہ فرقہ وارانہ کشیدگی کی صورت اختیار کر سکتی ہے جس سے مسلم عوام کا ہی نقصان ہوگا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تبدیلیٔ مذہب سے ہریجنوں کا مسئلہ حل ہوگا نہ ہی مسلم عوام کو کسی قسم کا فائدہ پہنچے گا۔ بہتر صورت یہی ہے کہ ہندوستانی سماج کے تمام پس ماندہ اور استحصال کردہ طبقے اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کو منوانے کے لیے مشترکہ جدوجہد کریں۔ اس سے ذات پات کا مسئلہ (جس کی جڑیں ہندوستانی سماج میں بہت گہری ہیں) مکمل طور پر حل تو نہیں ہوگا لیکن پس منظر میں ضرور چلا جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۸۱ء

شری لنکا میں تامل اقلیت

اور ہندوستان میں مسلم اقلیت کا مسئلہ

ایک دلچسپ موازنہ

سیلون میں تامل اقلیت کے ساتھ وہاں کی مقامی سنہالا اکثریت نے جیسا سلوک کیا ہے اس کی سخت سے سخت الفاظ میں مذمت کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر ملک میں اقلیتوں کے ساتھ وہاں کی اکثریتیں غیر منصفانہ اور کئی حالات میں ظالمانہ سلوک کرتی ہیں۔ اور اس طرح سے اکثر ان ممالک میں اقلیتوں اور اکثریتوں کے درمیان تصادم ہوتا رہتا ہے۔ اور یہ تصادم کبھی کبھی بڑی خوفناک اور تباہ کن صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ اقلیتیں مذہبی ہو سکتی ہیں یا لسانی اور نسلی۔ اکثریت اور اقلیت کے درمیان تصادم کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ امریکہ میں سفید فام اور کالی نسلوں کے درمیان، برطانیہ میں سفید اور ایشیائی قوموں کے لوگوں کے درمیان اور فلپائنس اور تھائی لینڈ میں کرسچین اور بدھ اکثریت اور مسلم اقلیتوں کے درمیان پر تشدد تصادم ہوتا رہتا ہے۔ ہندوستان میں یہ تصادم ہندوؤں اور مسلمانوں اور اب ہندوؤں اور عیسائیوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کے درمیان تصادم کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ تاریخی، سیاسی معاشی اور سماجی جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں ہے۔

ہم اس مضمون میں تامل اقلیت کے خلاف سیلون میں ہونے والے پر تشدد فسادات

پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کا موازنہ ہندوستان میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات سے کریں گے۔ اور اس سلسلے میں ہندوستان کے اخباروں کے رویّہ کا بھی تجزیہ کریں گے۔ ہندوستان کے قومی اخباروں کا اس مسئلے سے متعلق رویہ یہاں کے منتخب حکمراں افراد (RULING ELITE) کے غالب رجحانات پر دلچسپ روشنی ڈالتا ہے۔ ہم اس بات سے بعد میں بحث کریں گے۔

سیلون میں مختلف لسانی، مذہبی اور نسلی اقلیتیں پائی جاتی ہیں۔ سنہالا اکثریت آبادی کا ۷۲ فی صد ہیں۔ تامل (شری لنکن اور ہندوستانی شہریت والوں کو ملاکر) ۲۰ فی صد ہیں اور یہ شری لنکا کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ اگر مذہبی اعتبار سے آبادی کا تناسب دیکھا جائے تو بدھ مت کے ماننے والے ۶۷ فی صد، ہندو ۱۷ فیصد، عیسائی ۸ فیصد اور مسلمان ۷ فیصد ہیں، ان مذہبی گروہوں میں آپسی تصادم ہوتے رہتے ہیں حالانکہ ماضی میں برطانوی حکمرانوں نے سیلون کو دنیا کے سامنے برطانوی راج کا پرامن اور سب سے زیادہ وفادار حصہ بنا کر پیش کیا تھا۔ بدھ مت کے ماننے والوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں میں پچھلی صدی سے ٹکراؤ چلا آرہا ہے۔ عیسائیوں اور بدھسٹوں کے درمیان ۱۸۸۲ء میں کولمبو میں فسادات ہوئے تھے۔ اور سنہالیوں اور مسلمانوں کے درمیان 1915 میں۔ ۱۹۸۲ میں بھی سنہالیوں اور مسلمانوں کے درمیان سخت جھڑپیں ہوئیں تھیں۔ مسلمانوں اور سنہالیوں کے درمیان جھڑپوں کی بنیادی وجہ سیاسی کم اور معاشی زیادہ ہے۔ یاد رہے کہ سیلون میں مسلمان معاشی طور پر نہ صرف بہتر حالت میں ہیں بلکہ بعض معاشی میدانوں میں ان کا کنٹرول ہے۔ تجارت کے میدان میں مسلمان خاص طور سے بہت آگے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں تجارت پر سات بوہرہ مسلم خاندانوں اور کچھ میمن اور پارسیوں کی مکمل اجارہ داری تھی۔ یہ لوگ بڑے ٹھاٹ باٹ اور تزک و احتشام کے ساتھ رہتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اس اجارہ داری کی وجہ سے سنہالی تاجروں کو اس میدان میں سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ اور انھیں اپنے معاشی مفادات کا رُخ پلانٹیشن، گریفائٹ کی کانوں اور شراب کی تجارت کی طرف موڑنا پڑا۔ اس وجہ سے مسلمانوں اور سنہالیوں کے درمیان تناؤ پیدا ہوا جو کبھی کبھی فسادات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

لیکن دراصل لڑائی تو تامل اور سنہالیوں کے درمیان رہی ہے۔ ان دو لسانی

اور نسلی گروہوں کے درمیان ہمیشہ سخت ٹکراؤ رہا ہے۔ ان کے درمیان جھگڑے کی نوعیت ایسی ہی ہے جیسے کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے، تامل جیسا کہ اوپر بتایا گیا سیلون کی آبادی کے ۲۰ فیصد ہیں۔ اور وہاں کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ ہندوستانی مسلمان بھی تقسیم وطن سے پہلے (تقریباً ۲۵ فی صد تھے) اور آج بھی (تقریباً ۱۰ فی صد ہیں) ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی طرح تامل بھی سیلون کے بعض علاقوں (خصوصاً شمال میں جافنا) میں بھاری اکثریت میں ہیں۔ تقسیم وطن سے پہلے جس طرح شمال اور شمال مغرب کے مسلمانوں کے بعض طبقوں نے دو قومی نظریہ پیش کر کے اپنے لیے الگ ملک کی مانگ کی تھی۔ اسی طرح سیلون کے شمال میں رہنے والے تامل کا ایک طبقہ وہاں الگ ریاست بنانے کی مانگ کر رہا ہے۔

سنہالی اور تامل اپنے آپ کو الگ الگ قوم تصور کرتے ہیں۔ تامل متحدہ تنظیم برائے آزادی کے لیڈر اس بات پر مصر ہیں کہ "تاریخی" روایتی اور فلسفیانہ وجوہات کی بنا پر سنہالی اور تامل کبھی متحد ہو کر نہیں رہ سکتے۔" تقسیم وطن سے پہلے مسلمانوں کی قومیت سے متعلق مسلم لیگ نے جو موقف اختیار کیا تھا اسی سے ملتا جلتا موقف سیلون کے تامل لیڈروں کا ہے اور اس کی وجوہات بھی تقریباً ایسی ہی ہیں۔ مسٹر راج گوپالن نے جو سپریم کورٹ کے وکیل اور تامل ایلم امدادی کمیٹی کے چیئرمین ہیں، دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ سیلون میں تامل مسئلہ کا حل سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہاں تاملوں کے لیے الگ ہوم لینڈ بنایا جائے۔ اسی مقصد کو لیکر تامل متحدہ تنظیم برائے آزادی نے پچھلے چناؤ میں حصہ لیا تھا۔ اور تامل علاقوں سے تمام نشستیں حاصل کی تھیں۔ تاملوں کے نوجوانوں کا ایک انتہا پسند طبقہ الگ تامل ریاست کے قیام کے لیے مسلح جدوجہد کا قائل ہے۔ یہ بات عام طور پر ہندوستان کے قومی اخباروں میں نہیں چھپی (یا اسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی) کہ ۲۳ جولائی کو سیلون میں تاملوں کے خلاف تشدد پھوٹ پڑنے سے پہلے تاملوں کے ایک نوجوان مسلح گروپ نے جافنا علاقے میں سیلونی فوج کے ایک حفاظتی دستے پر حملہ کر کے ۱۳ فوجیوں کو ہلاک کر دیا تھا۔

اسی واقعہ کے ردِعمل میں سنہالیوں نے تاملوں پر منظم طریقے سے حملہ کر دیا۔ یہ بات بھی

بڑی دلچسپ ہے کہ سنہالیوں نے بھی ان فسادات میں تاملوں کے خلاف وہی تکنیکیں استعمال کی ہیں جو عام طور پر ہندو مسلم فسادات کے دوران کی جاتی ہیں۔ ایک طرف ان فسادات میں افواہوں سے بڑا کام لیا گیا اور دوسری طرف منظم طریقے سے تاملوں کے مکانات اور دوکانوں کو لوٹنے اور جلانے کے لیے نشان لگائے گئے۔ پولیس اور فوج کا بھی ان فسادات میں جانبدارانہ رویّہ تھا۔ پولیس اور فوج کی پوری ہمدردی سنہالی حملہ آوروں کے ساتھ تھی۔ ہندوستان میں بھی ہندو مسلم فسادات کے دوران عام طور پر پولیس اور صوبائی مسلح پولیس کا رویّہ جانبدارانہ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات ہمیں تسلیم کرنا پڑے گی کہ سیلون میں پولیس اور فوج کی یہ جانبداری تمام حدود کو تجاوز کر گئی تھی۔ یہاں تک کہ خود صدر جے وردن کو تسلیم کرنا پڑا کہ فوج نے ان کے احکامات کو بھی نظر انداز کر دیا اور نتیجتاً کئی فوجیوں کا کورٹ مارشل کیا گیا۔

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جس طرح ہندوستان کی تقسیم کی برطانوی سامراج نے ہمت افزائی کی سیلون میں بھی امریکی سامراجیت اپنا رول ادا کر رہی ہے۔ صدر جے وردھن دائیں بازو کے انتہا پسند اور کمیونسٹ دشمن ہیں۔ انھوں نے ان فسادات کا سارا الزام کمیونسٹوں اور بائیں بازو کی طاقتوں پر لگایا ہے اور بائیں بازو کے لیڈروں کو بڑی تعداد میں گرفتار بھی کیا ہے۔ امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ موقع کا فائدہ اٹھانے کے لیے فسادات کے دوران آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔ صدر جے وردھن نے بھی اس موقع کو بائیں بازو کی طاقتوں کو دبانے کے لیے غنیمت جانا۔ امریکہ اس علاقے میں اپنا وجود کسی طرح بھی اور کسی بھی قیمت پر قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اور سیلون میں جو کچھ ہوا وہ اسے اس بات کا موقع فراہم کرتا ہے۔

سنہالیوں اور تاملوں کے درمیان منافرت کی وجہ، اور وجوہات کے علاوہ، معاشی بھی ہے۔ ہندوستان ہی کی طرح سیلون بھی برطانوی سامراج کا ایک حصّہ تھا۔ اور یہاں کی معیشت سامراجی پالیسیوں کی وجہ سے بنیادی طور پر پلانٹیشن تک محدود رہی۔ پلانٹیشن معیشت کو چلانے کے لیے ہندوستان سے بڑی تعداد میں تامل مزدوروں کو لیجایا گیا۔ اس طرح تاملوں کی آبادی سیلون میں بڑھتی چلی گئی۔ ادھر ہندوستان سے گئے ہوئے تاجروں نے تجارتی معیشت پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ اور سنہالی سرمایہ دار اس میدان میں بھی پیچھے رہ گیا۔

تاملوں کی وجہ سے گورنمنٹ اور پبلک سیکٹر آسامیوں کے لیے بھی سنہالیوں کو سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ آسامیاں جامد معیشت (STAGNANT ECONOMY) میں پہلے ہی محدود ہوتی ہیں۔ سنہالی تاملوں کو یوں بھی باہر سے آئے ہوئے تصور کرتے ہیں جو نسلی، لسانی اور تہذیبی اعتبار سے ان سے بالکل مختلف ہیں۔ (فرقہ پرست ہندو بھی مسلمانوں کے متعلق یہاں ایسا ہی تصور رکھتے ہیں) اسی بات کا نتیجہ تھا کہ سنہالی پیٹی بورژوا دانشوروں نے اپنی علیحدہ شناخت پر زور دیا اور بدھ مذہب اور سنہالی تہذیب کے ذریعہ اپنا تشخص قائم کیا۔ سنہالی احیاء پرستی جتنا زور پکڑتی گئی، تاملوں کی طرف جذبہ عناد بھی اتنا ہی بڑھتا چلا گیا۔ ہماری جنگِ آزادی کے دوران بھی ہندو اور مسلم احیاء پرستی نے زور پکڑا تھا اور دونوں مذہب کے انتہا پسند اور فرقہ پرست عناصر اپنے اپنے علیحدہ تشخص پر اصرار کرنے لگے تھے۔

ہندوستان کے قومی اخباروں کا رویہ اس معاملے میں تقابلی اور تجزیاتی مطالعے کے اعتبار سے بڑا دلچسپ ہے۔ ان اخباروں نے، جس میں ٹائمز آف انڈیا، انڈین ایکسپریس، ہندوستان ٹائمز اور دیگر اخبارات شامل ہیں، سیلون میں تامل کے خلاف تشدد کو شاہ سرخیوں میں پہلے صفحوں پر متواتر چھاپا ہے۔ آج تک روزانہ یہ خبریں چیختی ہوئی سرخیوں کے ساتھ چھپ رہی ہیں۔ یہ سارے اخبارات پوری تفصیل کے ساتھ تاملوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی خبریں پوری اہمیت کے ساتھ چھاپ رہے ہیں۔ تشدد کی مذمت میں کئی اداریئے اور مضامین بھی چھاپے۔ بعض اخباروں نے تو یہ رائے بھی دی کہ ہندوستان کو ایسے موقع پر خاموش نہیں رہنا چاہیے اور تاملوں پر ہونے والی زیادتیوں کو روکنے کے لیے اگر ضروری ہو تو سیلون کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اقدام کرنا چاہیئے۔ بعض صحافی جو زیادہ محتاط تھے وہ ہندوستان اور سیلون حکومتوں کو باہمی تعاون سے اس مسئلے کو حل کرنے پر زور دے رہے تھے۔ بعض اخباروں اور افراد نے فوجی مداخلت کی بھی رائے دے ڈالی۔ بہرحال ان اخبارات میں مسلسل کئی کئی دنوں تک تامل کی حمایت میں بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا گیا۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہی قومی اخبارات ہندو مسلم فسادات کے دوران کیا رویہ

اختیار کرتے ہیں؟ اکثر ان فسادات کی خبریں جن میں مسلمانوں کا جانی اور مالی نقصان سب سے زیادہ ہوتا ہے کہیں اندر کے صفحے پر کونے میں چھاپی جاتی ہیں۔ مضامین اور اداریوں میں اس کا تجزیہ بھی اس طرح کیا جاتا ہے کہ یا تو صحیح حقیقت اُبھر کر سامنے نہیں آتی یا کسی نہ کسی طرح سے سارا الزام اقلیت کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔ پولیس کے جانبدارانہ رویّے کی خبروں کو سرے سے شائع ہی نہیں کیا جاتا۔ سری لنکا میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مقتولین کی تعداد ۲۵۰ بتائی جاتی ہے اور غیر سرکاری اعداد کے مطابق ...۱۔ راحت گھروں میں پناہ گزینوں کی تعداد ...۳۲ بتائی گئی ہے۔ اس کے برخلاف آسام میں بنگالی مسلم مقتولین کی تعداد سرکاری اعداد کے مطابق ..۱۱ اور غیر سرکاری اعداد کے مطابق ...۴ سے زیادہ تھی۔ نیلی میں اس قتل عام کا واقعہ نہایت سنگین اور دل ہلا دینے والا تھا لیکن کتنے قومی اخباروں نے اس واقعے کی خبر چھاپی۔؟ اگر انڈیا ٹوڈے نیلی کے مہلوکین کی تصاویر نہ چھاپتا تو شاید عام لوگوں کو اس قتلِ عام کی خبر تک نہ ہوتی۔

کئی قومی اخبار اور دیگر افراد جو تاملوں کی حمایت میں آج حکومت ہند سے مداخلت کی مانگ کر رہے ہیں۔ یہی اخبار اور افراد حکومت ہند کی اس بات پر سخت نکتہ چینی کر رہے تھے کہ اس نے اپنا ایک سفیر عرب ملکوں میں نیلی کے واقعات کی صفائی پیش کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ان اخبارات کا کہنا تھا کہ یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے اور ہم کیوں کسی ملک کے سامنے اس واقعے کی صفائی پیش کریں۔

پارلیامنٹ میں بحث کے دوران بی جے پی کے ممبر مسٹر جیٹھ ملانی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آج کی دنیا میں اقلیتوں کے حقوق کا سوال کسی ایک ملک کا سوال نہیں رہ گیا ہے۔ اگر کسی بھی ملک میں اقلیتوں پر ظلم ہوتا ہے تو ہمیں مداخلت کر کے ان کے حقوق کی حفاظت کرنا چاہیے۔ جیٹھ ملانی صاحب نے بالکل درست بات کہی لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جیٹھ ملانی صاحب یا ان کی پارٹی بی جے پی ہندوستان میں اگر اقلیتوں پر ظلم ہو رہا ہو یا ان کا قتلِ عام ہو رہا ہو (جیسا کہ نیلی میں ہوا) کیا کسی دوسرے ملک کو ان کے حق میں آواز اٹھانے کی اجازت دے گی۔؟ یا فوراً شور مچایا جائے گا کہ یہ ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت ہے اور اسے ہم ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔؟ بی جے پی کے صدر واجپائی جی نے سری لنکا کے صدر

سے اس بات کی مانگ کی کہ وہ تامل کے خلاف فسادات کی بین الاقوامی شہرت کے مالک جج کی قیادت میں عدالتی تحقیقات کرائیں تاکہ سری لنکا حکومت سے اس سلسلے میں جو غلطیاں ہوئی ہیں وہ دنیا کے سامنے آسکیں۔ کیا وا جپئی جی یہی حق بنگلہ دیش کے کسی لیڈر کو دیں گے کہ وہ نیلی میں بنگالی مسلمانوں کے قتلِ عام کی عدالتی جانچ کی مانگ کرے تاکہ اس معاملے میں حکومت ہند کی ذمہ داریوں کا تعین کیا جاسکے۔ ؟

جذبات کی رَو میں بہہ کر ہم معروضیت کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن کے منطقی نتائج کو خود ہم قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے۔ اگر ہمارے قومی اخبار اور وہ محترم افراد جن کا اوپر ذکر کیا گیا وہی رویّہ ہندوستان میں ہونے والے فسادات سے متعلق اختیار کریں جو وہ سری لنکا تامل اقلیت کے معاملے میں اختیار کیے ہوئے ہیں تو ہمارے فرقہ وارانہ فسادات کے مسائل بڑی آسانی سے حل ہو سکتے ہیں۔

——————— ۱۱ اگست ۱۹۸۳ء

دہرہ دون کے مسلمان
بدلتے ہوئے رُجحانات

مسلمان ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور ملک کی سیاست میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ تقسیمِ وطن کے بعد بھی مسلمانوں کی بڑی بھاری اکثریت ــــ مسلم اکثریت والے علاقوں کو چھوڑ کر ــــ ہندوستان میں ہی رہی اور اس طرح اس نے اپنے وطنِ عزیز سے محبت کا ثبوت دیا۔ تقسیمِ وطن سے پہلے اور بعد کی سیاسی اور سماجی پیچیدگیوں اور چند ادھر ادھر بکھرے ہوئے فرقہ پرست مسلمانوں کے مبینہ برتاؤ کے پیشِ نظر اس ثبوت کو ناکافی سمجھا گیا۔ مسلمان اپنے ہموطنوں کی نظر میں ہمیشہ مشکوک رہے، ان پر بار بار یہ الزام لگا ــــ الزام لگانے والوں میں بعض سنجیدہ اور عام طور پر مسلم دوست سمجھے جانے والے لوگ بھی کبھی کبھی شامل رہے ہیں۔ یا تو نتیجہ اخذ کرنے میں جلد بازی کی وجہ سے یا چند فرقہ پرست مسلمانوں کے رُجحان کو عام رجحان سمجھ لینے کے باعث کہ وہ ہندوستان سے کم اور پاکستان سے زیادہ ہمدردی رکھتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ہندوستان سے زیادہ پاکستان کی قدر و منزلت ہے۔ اور بعض وقت یہ الزام ہندوستان دشمنی کی سطح تک چھو گیا۔ اس الزام تراشی کا سلسلہ نہ صرف طویل ہے، اس کا دباؤ ہندوستانی مسلمانوں میں احساسِ جُرم بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ احساسِ جُرم کبھی کبھی ان کے شعوری برتاؤ کو غیر فطری بنا دیتا ہے۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اسلام اور فرقہ واریت کا اٹوٹ رشتہ ہے اور مسلمان اس وقت تک فرقہ پرست رہے گا جب تک اس کے لہو میں اسلام کی گرمی رواں دواں ہے ــ ایسے لوگ فرقہ واریت کو ٹھوس حالات کے سیاق و سباق سے ہٹا کر کائناتی شکل دے دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ یہ مذہبی نظریہ کی پیٹ کی اولاد ہیں اور اسی کی گود میں پروان چڑھتی ہے۔ صاحبِ نظر

اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرقہ واریت کا نُطفہ سیاست کی صُلب سے نکل کر معاشیات کے رحم میں پلتا ہے اور مفاد پرستوں کی گود میں پروان چڑھتا ہے۔ اس کا تعلق مذہب سے اتنا ہی ہے جتنا درخت کا ہوا سے۔ درخت ہلنے سے ہوا نہیں آتی، ہوا چلنے سے درخت ہلتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمان قومی دھارے سے کٹ گئے ہیں، ان کا مذہب، ان کی تہذیب۔ انہیں اس دھارے سے الگ تھلگ رکھتی ہے۔ اور ہندوستان کی شہریت سے زیادہ اُنھیں عالمی اسلامی برادری پر فخر ہے۔ ایسے ہی اور متعدد الزام لگائے جاتے ہیں۔ خاص طور سے دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کی طرف سے جن میں جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس نمایاں رہی ہیں۔ مگر ان الزامات کی حقیقت کیا ہے؟ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انہیں صحیح یا غلط قرار دینا آسان ہے۔ برسوں سے ہمارے سیاست داں اور دانشور یہی کرتے آئے ہیں۔ ان میں ابھی کوئی مرد میدان ثابت نہیں ہوا پہلی مرتبہ رگھوراج گپتا نے جو سماجی بشریات۔ (SOCIAL ANTHROPOLOGY) کے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک لایق استاذ ہیں؛ یہ ذمہ داری سنبھالی ہے اور قابل فخر کامیابی کے ساتھ۔

سوشیل انتھروپالوجی جدید سماجی علوم میں مختلف تہذیبوں، مذہبی فرقوں، قومی وحدتوں اور جغرافیائی حدود میں رہنے والے انسانی گروہوں کی کلی تحقیق کے اعتبار سے خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ آج تک ہندوستان میں سماجی علم کی اس شاخ کا فوکس قبائلی زندگی اور ہندو ذات پات کا نظام رہا ہے۔ ہندو مسلم تعلقات جیسا مضمون جو ہماری قومی زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سماجی علوم کے محققوں نے نظر انداز کر رکھا تھا۔ رگھوراج گپتا اس کی طرف متوجہ ہوئے اور دس سال مسلسل اس پر دہرہ دون جیسے یو۔پی کے سرحدی علاقے میں تحقیق کی اور وہ بھی بھرپور اور ہمہ گیر۔ بڑی جانفشانی سے تیار کیا گیا یہ تحقیقی مطالعہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی تھیسس کے طور پر پیش ہو کر کامیاب رہا۔ ڈاکٹر گپتا نے اس پر نظرثانی کر کے کتابی صورت میں چھپوایا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ رام گوپال نے لکھا ہے جو 'ہندوستانی مسلمان ـــ سیاسی تاریخ (۱۸۵۷ ـــ ۱۹۴۷) تصنیف کر کے اس میدان میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ رام گوپال پیش لفظ میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تفریقی نیت سے اسلام اور ہندو دھرم کے دو ایسے الگ الگ متوازی مذہبی نظام ہونے پر جو ایک دوسرے سے کسی مقام پر نہیں مل سکتے۔ زور دینا ایک بات ہے اور تاریخی پس منظر میں یہ دیکھنا بالکل دوسری بات کہ مذاہب،

چاہے وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، مشترکہ مقاصد۔ ایسے مشترکہ مقاصد جو قومی اور سیاسی، بلکہ سماجی زندگی سے بھی متعلق ہوں۔ حاصل کرنے میں شاید ہی حائل ہوتے ہیں"۔ رام گوپال اس کی مثال ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے دیتے ہیں جس میں اس وقت ہندو مسلمان ہم سے زیادہ مذہب پرست ہونے کے باوجود کندھے سے کندھا ملاکر انگریزوں کے خلاف لڑے تھے ۱۸۵۷ء ہندو مسلم اتحاد کی روشن علامت ہے۔

ڈاکٹر گپتا ہندو مسلم تعلقات کو صحیح تناظر میں دیکھتے ہیں۔ کتاب کی ابتدا ہی میں وہ اپنی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ فرقوں کے درمیان تناؤ ایک وقتی معاملہ ہے، ان کے باہمی رشتے کا مستقل مرحلہ نہیں۔ سماجی یکجہتی، بامقصد میل ملاپ، باہمی امداد اور سماجی خوشحالی میں اضافہ کرنے والے آپسی رشتے ہمارے رنگارنگ سماج اور گنگ وجمن تہذیب کو استوار کرنے کے لیے راستہ تیار کرتے ہیں اس لیے ہندو مسلم تعلقات میں وقتی تناؤ کو بنیاد بنانا غلط ہوگا۔ اسی طرح شخصی تعصبات کا شکار ہو کر اس نازک مسئلہ کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان تعصبات کا تجزیہ کرنا اور شخصی رجحانات کو سماجی طبقاتی اور معاشی حالات کے پس منظر میں سمجھنا ضروری ہے۔ ذہنی رجحانات مادی پس منظر کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور حالات میں تبدیلی کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ متوسط طبقہ کے رجحانات مزدور طبقوں اور دوسرے نچلے طبقوں کے رجحانات سے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی ایک فرد یا ایک طبقے کے ذہنی جھکاؤ کو پوری قوم یا مذہبی گروہ کا بالکلیہ غیر لچکدار ذہنی رویہ قرار دینا غیر سائنسی رویہ ہے۔ ڈاکٹر گپتا نے بڑی احتیاط سے اس ناقص اپروچ سے اپنا دامن بچایا ہے۔ ڈاکٹر گپتا نے مسلمانوں کے مختلف طبقوں، ذاتوں اور علاقائی گروہوں کے ردِ عمل کا سائنسی تجزیہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ عمر کے فرق کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ایک ناقابل تقسیم وحدت نہیں قرار دیا۔ ہندوستانی مسلمان بھی اکثریتی فرقے کی طرح طبقوں، ذاتوں اور علاقائی گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور مختلف مسائل پر ان کا ردِ عمل یکساں نہیں ہوتا بلکہ ذہنی اور مادی پس منظر کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ کئی لوگ جن میں خود مسلمان بھی شامل ہیں، مسلمانوں کو ایک ناقابل تقسیم مذہبی اور تہذیبی وحدت قرار دے کر غلط نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر گپتا نے اپنا کام آسان بنانے کے لیے دہرہ دون کے مسلمانوں سے گہرا ربط قائم کیا

اور پوری طرح ان کا اعتماد حاصل کیا۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے اس مسئلے پر ہمدردی اور ایمانداری سے کام کیا ہے، کہیں ڈنڈی مارنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اور ان کے معاون کارکنوں نے زبان اور لباس کے اعتبار سے بھی مسلمانوں سے ہم آہنگی پیدا کی تاکہ پورے اطمینان سے ان کے سوالوں کے جواب مل سکے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی عام طور پر اور دہرہ دون کے مسلمانوں کی خاص طور پر معاشی حالت مقابلتہً کمزور رہی ہے۔ اس کا اندازہ دوسری چیز کے علاوہ اس بات سے بھی ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر گپتا نے دہرہ دون کے مسلمانوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ——— (۱) اوپری طبقہ۔ ان میں وہ مسلمان شامل ہیں جن کی آمدنی ۱۵۰ روپے ماہوار سے زیادہ ہے۔ (۲) متوسط طبقہ:۔ اس طبقے کے مسلمانوں کی آمدنی ۷۵ سے ۱۵۰ روپے ماہانہ ہے اور (۳) نچلا طبقہ۔ جس کی آمدنی ۷۵ روپے مہینہ فی کس سے زیادہ نہیں۔ ۷۵ فی صدی مسلمان خاندان نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاید دوسرے شہروں میں مسلمانوں کی معاشی حالت قدرے بہتر ہو، مگر دہرہ دون میں واقعی قابل رحم ہے۔

دولت کی تقسیم میں اگر اس قدر ناہمواری ہو تو اکثریت اور اقلیتی فرقوں میں تناؤ پیدا ہونا لازمی ہے۔ تقسیم وطن کے پیچھے بھی معاشی عوامل سیاسی عوامل کے ساتھ ساتھ اپنا کام کر رہے تھے۔ بامقصد اور پر امن ترقی کے لیے ان ناہمواریوں کو دور کرنا بہت ضروری ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں مصنف نے کل ہند پیمانے پر تقسیم سے پہلے یوپی میں مسلمانوں کی سماجی اور معاشی حالت کا جائزہ لیا ہے اور بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جہاں تک یوپی کا تعلق ہے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں ملازمتوں اور تعلیمی میدان میں خاصی مراعات حاصل تھیں اور مسلمانوں کی علیحدگی پسند سیاست انھیں مراعات کو قائم رکھنے کی جدوجہد تھی۔ چونکہ یہ مراعات خاص طور سے شہری علاقوں میں رہنے والے اوپری طبقوں کے مسلمانوں کو حاصل تھیں۔ مسلم لیگ ـــ جو ان طبقوں کی نمائندہ جماعت تھی۔ انہیں مراعات کو اپنی بنیادی مانگوں کی شکل میں پیش کرتی تھی۔ جب کانگریس کے رہنماؤں نے اوپری طبقے کے ان مسلمانوں کی مراعات کو جوں کا توں تسلیم کرنے سے انکار کردیا تو مسلم لیگ نے دو قومی نظریہ کا نعرہ دیا۔ اور اسی رسہ کشی میں ملک تقسیم ہوگیا۔ لیکن عوام کی حالت ملک کو بانٹنے والی لائن کے دونوں طرف ابتر ہی رہی۔

تقسیم کے بعد دہرہ دون شہر کے تقریباً دو تہائی مسلمان (تقریباً دس ہزار) شہر چھوڑ کر یا تو پاکستان چلے گئے یا ہندوستان کے ان علاقوں میں چلے گئے جہاں سے وہ آئے تھے۔ دہرہ دون میں مسلمانوں کی آبادی اس طرح پندرہ ہزار سے گھٹ کر ۵۰۰۰ رہ گئی۔ اور ان کی جگہ تقریباً ۱۵۰۰۰ ہندو مہاجرین نے لے لی جو پنجاب اور سندھ سے آئے تھے۔ دہرہ دون کے زیادہ تر مسلمان آس پاس کے علاقوں جیسے کہ بجنور، سہارنپور، مراد آباد وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر گپتا کے سروے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اکثر مسلمانوں میں زیادہ شادی نہیں ہوتی حالانکہ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام میں ذات پات کا نظام نہیں ہے۔ مگر ہندوستانی مسلمان اس سے نہیں بچ سکا۔ دہرہ دون کے مسلمان اس لعنت کے شکار ہیں۔ حالانکہ ان میں ذات بندی ہندوؤں کی طرح سخت نہیں ہے۔ آج کا جولاہا کل زندگی کا معیار بلند ہونے پر شیخ کہلوانے لگتا ہے اور ترقی کر کے شاید سید بھی بن جاتا ہے۔ مگر مسلمانوں کی کافی تعداد جیسا کہ سروے سے معلوم ہوتا ہے ذات بندی کی روزمرہ کے برتاؤ میں پابند ہے۔ کچھ ذاتوں کو نوارذل (بہت رذیل) کہا جاتا ہے۔ ان میں حلال خور، لال بیگی، ابدل اور بیدیا شامل ہیں۔ ان سے کوئی اشراف مسلم میل جول نہیں رکھتا اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ انہیں مسجد میں داخل ہونے اور قبرستان میں میت دفن کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ ذاتیں ہندوؤں کی طرح ایک ساتھ کھانے میں شریک ہونے کی بھی روادار نہیں۔ مثلاً گھوسی اور کنگار یا نہ تو گائے کا گوشت خود کھاتے ہیں یا نہ ہی ان مسلمانوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے ہیں جو گائے کا گوشت کھاتے ہوں۔ ان میں سے کچھ ذاتیں ہندو دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتی ہیں خاص طور سے کالی کی۔ دفالی ذات کے مسلمان اہم تہواروں پر گنگا اشنان کرتے ہیں اور شب برات کو ہندوؤں کی طرح شرادھ کا تہوار بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر گپتا کے سروے میں جو ۵۰۴ مسلم خاندان شامل تھے ان میں، ۸۰ مزدور، ۶۲ چھوٹے دوکاندار ۵۵ معمار، ۴۵ درزی، ۳۴ لوہار، ۲۶ سرکاری ملازم، ۱۰ ٹھیکیدار، ۱۰ قصاب اور صرف ۴ ڈاکٹر ۴ ٹیچر اور ۴ وکیل تھے۔ اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسلمان عام طور پر کم آمدنی والے گروپ میں آتے ہیں۔ یاد رہے کہ ان میں وہ مسلمان بھی شامل ہیں جن کو شمار کیا ہے۔ ان مسلمانوں کا

مذہب کی طرف رویہ کیا ہے؟ ڈاکٹر گپتا اپنی تحقیق میں مذہب کے سماجی پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ سروے میں شامل خاندان کے لوگوں سے بات کرنے پر پتہ چلا کہ مسلمان عام طور پر نہ صرف دوسروں کے مذہب کا احترام کرتا ہے بلکہ ان کا اپنے مذہب پر قایم رہنے کا حق تسلیم کرتا ہے۔ ایک معمر مسلمان نے تو یہاں تک کہا کہ میرے لیے اسلام بہترین مذہب ہے، مگر دوسرے اہل مذاہب کے لیے ان کا مذہب بہترین ہے۔ یعنی اس معاملے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور آپسی تعلقات میں مذہب کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ نچلے اور درمیانی طبقے کے مذہب پرست مسلمانوں کو عموماً یہ کہتے سنا گیا کہ میکانکی طور پر نماز پڑھنے اور روزے رکھنے سے کیا فائدہ اگر ہمارے کردار میں اس سے تبدیلی نہ ہو اور ہم ایمانداری سے، پرہیزگاری سے اور انسانی خدمت میں زندگی نہ گزاریں۔

دہرہ دون کے مسلمانوں میں تعلیم کا اوسط بڑھ رہا ہے۔ مگر رفتار قدرے سست ہے۔ سروے کے وقت اوپری طبقہ کے مسلمانوں میں تعلیم کا اوسط ۵۶ فیصد، درمیانی طبقے کا ۶۴/۵ فی صد اور نچلے طبقے میں ۴۶ فیصد تھا۔ مسلم عورتیں تعلیم کے میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں، مگر مردوں سے وہ اب بھی بہت پیچھے ہیں۔ سب عورتوں کو ملا کر ان کا اوسط ۲۹/۸ فیصد سے زیادہ نہیں جب کہ ۸ سے ۱۸ سال کی لڑکیوں میں تعلیم کا اوسط ۵۹/۱ فیصد ہے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن کے حادثے تک درمیانی اور اوپری طبقے کے مسلمانوں میں مسلم لیگ کافی مقبول تھی جب کہ نچلے طبقے کے مسلمان عام طور پر جمعیتہ العلماء سے ہمدردی رکھتے تھے۔ جمعیتہ العلماء کی کچھ میٹنگیں اس زمانے میں کافی کامیاب رہیں۔ مسلم لیگ نے ہمیشہ ان جلسوں میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی اور دہرہ دون کا غیر جانبدار مسلمانوں کا ایک حصہ لیگ کی ان تشدد آمیز حرکتوں کا سخت مخالف تھا۔ دہرہ دون کے ۳۰ فیصد مسلمانوں نے اپنا ووٹ جمعیتہ کے امیدوار کو دیا۔ ملک کے حصے بکھرے ہونے پر ہندو مسلم فسادات میں دہرہ دون کے مسلمانوں کو بھاری نقصان ہوا اور مسلم لیگ کے لیڈر انھیں اپنے حال پر چھوڑ کر پاکستان ہجرت کر گئے۔ فسادات کی وجہ سے دہرہ دون کے ...۱۵ میں سے تقریباً...۱ مسلمانوں کو شہر چھوڑ کر جانا پڑا۔ اس غیر معمولی حادثے نے مسلمانوں کی آنکھ کھول دی اور رہی سہی مسلم لیگ کی توقیر بھی ختم ہوگئی۔ سروے سے معلوم ہوتا ہے کہ چند مسلمان اب بھی علیحدہ ووٹنگ سسٹم چاہتے ہیں، اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی خاطر مگر یہ بہت ہی تھوڑے

ہیں۔ عام طور پر ملے جلے سسٹم کو پسند کیا جاتا ہے۔ خاص طور سے نوجوان طبقے میں بڑا صحت مند رویّہ پایا جاتا ہے۔ نوجوانوں کی بھاری تعداد فرقہ واریت سے بیزار اور سیکولر نظام کے حق میں ہے اور سیکولر جمہوریت کے لیے ملے جلے نظام کو بنیادی اہمیت دیتی ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی شعور کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عام چناؤ میں دوسروں کے مقابلے ووٹ دینے والے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اوسطاً ۷۵ فی صد مسلمان اپنے ووٹ کا حق استعمال کرتا ہے۔ تقریباً ننّو افراد سے سوال کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دہرہ دون میں نوں کی اکثریت سیکولر جماعتوں کو ووٹ دیتی ہے۔ ان سو افراد میں سے ۱۸ کانگریس کو، ۱۸ جمعیۃ کے امیدوار کو، ۲۹ پرجا سوشلسٹ کے امیدوار کو، ۱۵ کمیونسٹ پارٹی کو ووٹ دیتے ہیں۔ ۲۰ افراد نے کوئی جواب نہیں دیا اور جماعت اسلامی کا حامی ایک بھی نہ ملا۔

کانگریس کو اوپری اور درمیانے طبقے کی حمایت سب سے زیادہ حاصل ہے۔ نچلے طبقوں میں جمعیۃ العلماء سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اوپری طبقہ بالکل اس کی حمایت نہیں کرتا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ پرجا سوشلسٹ نے نچلے طبقے کے مسلمانوں کی حمایت کی اس کے باوجود وہ ان میں مقبول نہیں ہے۔ البتہ درمیانی طبقے کے مسلمان براہِ راست کانگریس یا پرجا سوشلسٹ کے امیدواروں کے حق میں تھے اور جمعیۃ کی درمیان گیری کے مخالف۔ مگر نچلے طبقے کے مسلمانوں نے جمعیۃ کی حمایت کر کے یہ توازن بگاڑ دیا۔ اور اُسے خاص سیاسی اہمیت دے دی۔ مسلمانوں کی سیاست کا توازن دہرہ دون میں جمعیۃ کے ہاتھ آ گیا۔ ہماری سیاست کی چھٹی دہائی میں ملک کے حالات نے ایک نئی کروٹ لے لی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہندو فرقہ پرستی زور پکڑ رہی ہے۔ اس کے جواب میں مسلم فرقہ پرست بھی ابھرنے لگے۔ اور مسلم لیگ اور مسلم مجلس جیسی تنظیمیں قائم ہونے لگیں۔ اس طرح کے کچھ ووٹ کم ہو کر ان تنظیموں میں بٹ گئے۔ کانگریس نے مسلم مجلس سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر اسے اس میں خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ مرحلہ بھی بہت دیر پا ثابت نہیں ہوا۔ اور ملک کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ سیاسی توازن بھی بدلتا رہا۔

ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کی طرح دہرہ دون کے مسلمانوں کے سامنے بھی تقسیم وطن سے قبل بار بار یہ بات دہرائی گئی تھی کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں اور اس پروپیگنڈہ نے مسلمانوں کی

خاصی تعداد کو متاثر کیا۔ پارس رام نے ۵۱ - ۱۹۵۰ میں علی گڈھ کے مسلمانوں پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا اور یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے حالات سے مایوس ہو کر پاکستان کے متعلق ایک دلفریب اور رومانی تصور بنا رکھا ہے۔ رگھوراج گپتا اس نتیجے سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کی تحقیق کسی اور سمت میں اشارہ کرتی ہے۔ گپتاجی کہتے ہیں ہو سکتا ہے یہ مختلف عوامل کا ردّ عمل ہو۔ یاد رہے رگھوراج گپتا اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یہ نتیجے نہیں اخذ کر رہے ہیں بلکہ دہرہ دون کی گلیوں اور بازاروں میں گھوم پھر کر مسلمانوں سے بات چیت اور سوال جواب کر کے اور ان کا باقاعدہ تجزیہ کر کے یہ بات کہتے ہیں۔

ان باتوں کی کھوج لگانے کے لیے انہوں نے پہلے ۵۷-۱۹۵۶ء کا سال چنا جب ہندو مسلم تناؤ قدرے کم تھا۔ اس وقت دہرہ دون میں ایک چھوٹا سا حلقہ ان مسلمانوں کا بھی تھا جو پہلے لیگ میں رہ چکے تھے۔ دہرہ دون سے ہجرت کر کے پاکستان گئے ہوئے مسلمان بھی اکثر دہرہ دون آتے رہتے تھے۔ ان سے پاکستان کے بارے میں جو باتیں معلوم ہوئی تھیں وہ بھی بہت ہمت افزا نہیں تھیں۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ یو، پی سے گئے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ پنجابی مسلمانوں کا رویہ خوش گوار نہیں بلکہ بددل کرنے والا تھا۔ یو پی کا اردو پریس بھی پاکستان سے بددل تھا۔ سینکڑوں ہندوستانی مسلمان جنہوں نے قیام پاکستان کے لیے شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر رات دن کام کیا تھا۔ وہاں کے سیاسی حالات سے مایوس تھے۔

دہرہ دون کے مسلمانوں کی خاصی تعداد کا یہ کہنا تھا کہ تقسیم وطن ایک زبردست مصیبت تھی جو انہیں دربدر کر گئی ان کے گھر برباد ہو گئے اور پاکستان کسی طرح ان کا معاون ثابت نہیں ہوا۔

اکثر مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ حالانکہ وہ پچھڑے ہوئے اور محروم ہیں۔ مگر ہندوستان ترقی کی راہ پر گامزن ہے ہندا ان کا بھلا بھی ضرور ہو گا۔ گپتاجی یہ بھی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی ہندو پاک جنگوں نے اور پاکستان کی شرمناک شکست نے مسلمانوں کے دل سے پاکستان کا رہا سہا وقار بھی ختم کر دیا۔ گپتاجی اور ان کی ریسرچ ٹیم نے دہرہ دون کے مسلمانوں سے سوال کیا "قیام پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہوا یا مُضر"۔ ۸۲ فیصد مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ مضر ثابت ہوا۔ اور محض ۱۱ فیصد نے اسے مفید خیال کیا جبکہ باقی مسلمانوں کا

ردِ عمل ملا جلا تھا۔ ان جوابوں کا طبقاتی تجزیہ بھی دل چسپ ہے۔ اوپر اور بیچ کے طبقے کے مسلمان جو قیامِ پاکستان کے زبردست حامی تھے، سب سے زیادہ اس کے خلاف صف آرا نظر آئے مخالفت میں خاص طور سے درمیانی طبقہ سب سے آگے تھا۔ قیامِ پاکستان کو مفید ملنے والوں کا تعلق پرانی نسل سے تھا۔

گپتا جی کی تحقیق یہ بھی بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل میں پاکستان کے لیے کوئی کشش نہیں۔ انھیں دس سے بیس برس کی عمر کے درمیان کوئی ایسا مسلم نظر نہیں آیا جو پاکستان سے خاص دلچسپی رکھتا ہو۔ انھیں نوجوان مسلمانوں میں کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو قیامِ پاکستان کو ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں مفید خیال کرتا ہو۔ اس کے برخلاف ان میں مذہب کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کے خلاف جذبہ پایا گیا۔ ان کا خیال ہے تقسیمِ ملک سے ہندو اور مسلمان کے تعلقات میں تلخی پیدا ہوئی جو شاید دونوں ممالک کے اتحاد سے ہی دور ہو سکتی ہے۔

گپتا صاحب کی تحقیق یہ بھی بتاتی ہے کہ دہرہ دون کے مسلمانوں میں عام طور پر پاکستان سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ وہ اس جذبہ کا تجزیہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اکثر مسلمانوں کے رشتے دار اور بہن بیٹیاں دونوں طرف ہیں۔ ہند و پاک جنگ یا دونوں ملکوں کے تعلقات میں کسی قسم کی خرابی پیدا ہونے سے ان کے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگتے ہیں اور پھر فرقہ وارانہ روپ دھار لینے کا اندیشہ انھیں ہمیشہ خائف رکھتا ہے۔

محقق نے ایک اور دلچسپ تجربہ کیا ہے۔ اس نے پاکستانی سیاسی جماعتوں کی فہرست ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے رکھتے ہوئے ان کا ان جماعتوں کے بارے میں ردعمل معلوم کرنا چاہا۔ تین چوتھائی مسلمان کوئی جواب نہیں دے سکے۔ دوسرے مسلمانوں کا عام طور پر ردعمل یہ تھا "ان میں سے کس جماعت کو پسند کیا جائے؟ پاکستان میں کوئی ایسی سیاسی جماعت نہیں جس کی کوئی مستقل اور پائیدار سیاسی پالیسی ہو۔ یہ سب موقع پرست جماعتیں ہیں جو مطلب کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ ایسی بے اصول جماعتوں میں سے کسی بھی جما... کو پسند کرنا فضول ہے۔ صرف درمیانی طبقے کے مسلمانوں میں سے ۲۸ فی صد مسلمان... ...رالغف... کی لال قمیض والی جماعت کو پسند کیا ان کے خیال میں یہی ایک جماعت ہے جس کا صاف ستھرا ریکارڈ

ہے جس نے پچھلے کئی سالوں سے عوام کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کام کیا ہے اور قربانیاں پیش کی ہیں اور یہی جماعت ہندوستان پاکستان کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کرنے کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ مگر اوپری اور نچلے طبقے کے مسلمانوں میں سے کسی نے اس جماعت کو پسند نہیں کیا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ مسلم لیگ جو ملک کی تقسیم سے پہلے درمیانے اور اوپری طبقے کے مسلمانوں میں بہت مقبول تھی۔ اب مکمل طور پر اپنا اعتماد کھو چکی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درمیانہ اور اوپری طبقہ مکمل طور پر اس کا مخالف ہو گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ انتہا پسند، اور فرقہ واریت پر مبنی سیاست مسلمانوں کے لیے کشش نہیں رکھتی۔

ایک اور اہم سوال جو دہرہ دون کے مسلمان سے کیا گیا وہ پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دینے کے متعلق تھا تاکہ سیکولر حکومت کے سلسلے میں مسلمانوں کا رویہ معلوم ہو سکے۔ اُدھیڑ یا اس سے زیادہ عمر کے مسلمانوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مذہبی نظامِ حکومت کے حامی ہوں گے کیونکہ عام طور پر اس عمر کے لوگ مذہب سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس عمر کے مسلمانوں میں آدھے اسلامی نظام حکومت کے حق میں نہیں تھے، تقریباً پانچواں حصہ یا بیس فیصد اس معاملے میں غیر جانبدار تھے اور صرف ایک تہائی نے اسلامی جمہوریہ کی حمایت کی۔ مگر ان میں سے بھی اکثر پاکستان کے اس اعلان کو، کہ وہ اسلامی جمہوریت ہے، شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے اسے محض عوام کو گمراہ کرنے کی ترکیب قرار دیا انھیں پاکستانی نظامِ حکومت میں کوئی بات اسلامی طرز کی نظر نہیں آئی۔ ان ایک تہائی مسلمانوں نے پاکستانی حکومت کے اعلان کی حمایت کی مگر اس کے اعمال کی نہیں۔ اس معاملے میں بھی طبقاتی تجزیہ دلچسپ ہے۔

اسلامی جمہوریہ کی مخالفت سب سے زیادہ درمیانی طبقے کے مسلمانوں نے کی (۶۱٪) یہ یاد رہے کہ متوسط طبقہ رائے عامہ ہموار کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے اور اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات ہمیں تسلیم کرنی پڑے گی۔ کہ مسلمان سیکولر نظام کی طرف جھک رہا ہے۔ گپتا جی نے اس کے ساتھ ساتھ دو بیان کے اقتباس بھی دیئے ہیں جو اس سوال پر عام طور پر مسلمانوں نے دیئے۔

۱۔ اس سے یعنی اسلامی جمہوریہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت کمزور ہو جائے گی۔
جب ہندوستان نے سیکولر نظام اپنایا ہے تو پاکستان کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔

۲۔ فرقہ وارانہ جمہوریت کے دن اب گذر چکے ہیں۔ اب ہمیں مذہب اور سیاست کو الگ الگ کر دینا چاہیئے۔ تمام شہریوں کے لیے بلا تفریق مذہب ایک ہی غیر جانبدار قانون ہونا چاہیے اور ہر شخص کو اپنے مذہب کو ماننے کی آزادی بھی۔ اسی صورت میں حکومت کو تمام شہریوں کی یکساں وفاداری مل سکتی ہے۔

ایک سوال مسلمانوں سے یہ بھی کیا گیا تھا کہ وہ اپنے پسندیدہ تین ایسے اشخاص کے نام بتائیں جنہوں نے ان کی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ اپنے پسندیدہ اشخاص کا انتخاب بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے اس شخص کی امنگوں آدرشوں اور قدروں کا پتہ چلتا ہے۔ مسلمانوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ شخصیت آنحضرتؐ کی ہے۔ تقریباً ۴۴ مسلمانوں نے حضورؐ کا نام لیا۔ درمیانے طبقے کے مقابلے میں نچلے طبقے میں پیغمبر اسلام کے نام لیواؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ ۵۶ فی صد مسلمان جنہوں نے آنحضرتؐ کا نام نہیں لیا۔ درمیانے اور اوپری طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۴۴ فی صد مسلمانوں نے زور دے کر کہا کہ وہ آنحضرتؐ سے اپنی زندگی میں بہت متاثر ہوئے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اوپری طبقے کے مسلمانوں میں سے اپنی پسندیدہ یا متاثر کرنے والی شخصیتوں میں کسی نے حضورؐ کا نام نہیں لیا۔ ایسا نہیں کہ وہ حضورؐ کا احترام نہیں کرتے بلکہ شاید وہ اپنی ارضی زندگی میں اپنے ہمعصر رہنماؤں سے زیادہ متاثر ہیں یہ کہنا مشکل ہوگا کہ یہ کہاں تک مغربی تعلیم کا اثر ہے۔

ہمعصر رہنماؤں میں دہرہ دون کے مسلمان مولانا حسین احمد مدنی سے جو جمعیۃ العلماء کے صف اول کے لیڈر تھے زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے مداح سب سے زیادہ اوپری طبقے میں پائے گئے درمیانے اور نچلے طبقے میں ان کا اثر بتدریج کم ہوتا جاتا ہے۔ درمیانے اور نچلے طبقوں میں مولانا آزاد کا اثر سب سے زیادہ ہے مولانا آزاد ان میں اتنے ہی مقبول ہیں جتنے مہاتما گاندھی۔ تقریباً ۸۱ فی صد مسلمانوں نے یہ کہا کہ وہ مولانا آزاد سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اوپری طبقے میں مہاتما گاندھی بہت مقبول ہیں، اتنے ہی جتنے درمیانے اور نچلے طبقوں میں آزاد۔ مولانا محمد علی کا اثر صرف ۱۰ فیصد مسلمانوں تک محدود ہے پنڈت نہرو مسلمانوں کے سبھی طبقوں میں یکساں مقبول ہیں۔

نئی نسل میں اس سلسلے میں بھی خاص فرق نظر آتا ہے۔ اسکول جانے والے بچوں میں زیادہ اثر مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کا پایا گیا۔ رانا پرتاپ اور شیواجی کا بھی تصور بدل رہا ہے۔ مسلمان بچے

اب انھیں مسلم دشمن اور ہندو فرقہ واریت کے چیمپئن نہیں سمجھتے۔ رام اور کرشن جیسی مذہبی شخصیتوں کا بھی ان پر اثر پایا جاتا ہے راسخ العقیدہ مسلمان ماں باپ اس رجحان کے خلاف ہیں۔ اور اسے "آلودگی" قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر گپتا کہتے ہیں کہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تعلیم پر ہندو مذہب کا اثر زیادہ ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ غیر مذہبی ہیروؤں کا بھی اثر بڑھتا جا رہا ہے اور ڈاکٹر گپتا کا خیال ہے کہ اس طرح آگے چل کر سیکیولر تعلیم سے قومی یک جہتی میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر گپتا نے اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ پرانی نسل کے مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کے بعد ہندوستان کی جن مذہبی یا غیر مذہبی شخصیتوں کا اثر ہے وہ سب ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں مثلاً مولانا حسین احمد مدنی، مولانا آزاد، گاندھی جی یا پنڈت نہرو۔ ڈاکٹر گپتا کہتے ہیں کہ یہ بڑا صحت مند رویہ ہے اور اس کے نتائج دور رس ہوں گے۔

ہندو مسلم تعلقات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ کس حد تک ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ انحصار ایک معنی میں دونوں مذہب کے ماننے والوں کے درمیان تعلقات کی کسوٹی بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے مختلف پہلوؤں کو ٹھیک سے اُجاگر کیا جائے۔ دہرہ دون ایک شہری علاقہ ہے اور شہری مسلمان جغرافیائی یا مکانی اعتبار سے اپنے ہندو پڑوسیوں سے الگ رہتے ہیں۔ گاؤں میں سبھی ایک ہی بستی میں رہتے ہیں وہ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان لیکن شہروں میں وسعت پھیلاؤ کی وجہ سے الگ الگ محلوں میں رہنا ممکن ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گپتا نے دہرہ دون کی جداگانہ بستیوں کو نمونہ بنا کر کئی بنیادی سوال اٹھائے ہیں۔ جداگانہ بستیوں کا اقتصادی برتاؤ پر کیا اثر پڑتا ہے؟ مسلمان کس طرح اور کس کے ذریعہ اپنی دنیاوی ضروریات کو پورا کرتے ہیں؟ اور اس کا ان کے سماجی اور سیاسی رجحانات پر کیا اثر ہوتا ہے؟

محقق نے اپنے تجزیہ میں زیادہ تر صارف کی ضروریات کو مد نظر رکھا ہے جیسے کہ اناج، دال دلیہ، مسالے، ایندھن، سبزی ترکاری، دوسری عام ضروریات کی چیزیں اور درزی، دھوبی اور نائی کی خدمات عام طور پر مالی اعتبار سے مسلمان اتنے نچلے درجے میں ہے کہ بڑھئی، گھروں کو رنگ لگانے والے مزدوروں وغیرہ کی انھیں مشکل ہی سے ضرورت پیش آتی ہے۔ دہرہ دون میں چونکہ مہاجر ہندوؤں، شرنارتھیوں کی کافی تعداد ہے۔ اس لئے ڈاکٹر گپتا نے مسلمانوں کے

اقتصادی تعلقات کو صرف دو قسموں یعنی مسلمانوں اور غیر مسلم میں نہیں بانٹا ہے۔ بلکہ مؤخرالذکر کو مقامی ہندوؤں اور مہاجر ہندوؤں میں تقسیم کیا ہے۔

دہرہ دون میں مسلمان عام طور پر الگ محلّوں یا علاقوں میں رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اپنے بزنس، روزگار، پیشہ وغیرہ کے سلسلے میں وہ غیر مسلموں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ یہی تعلقات اکثر سماجی اور ذاتی رشتوں میں بدل جاتے ہیں۔ متوسطہ اور اوپری طبقہ کے سبھی مسلمانوں کے تعلقات دوسرے لوگوں سے پائے جاتے ہیں۔ مگر نچلے طبقوں میں تقریباً ۲۴ فیصد مسلمان ایسے تعلقات پیدا نہیں کر پاتے نچلے طبقے کے مسلمانوں کا ایک حصّہ اس طرح الگ تھلگ رہ جاتا ہے یہ وہ حصہ ہے جو مسلمانوں میں رہ کر کام کرتا ہے۔ مسلمانوں میں نچلے طبقہ کے لوگ سب سے زیادہ پناہ گزینوں (پاکستان سے تقسیم کے بعد آئے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں) سے تجارتی تعلقات رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے پناہ گزینوں سے تعلقات مقامی ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ نچلے طبقے کے مسلمان متوسط اور اوپری طبقے کے مسلمانوں کے مقابلے میں نچلی ذات کے ہندوؤں اور ہریجنوں سے بہت قریب ہیں حالانکہ عیسائیوں سے ان کے تعلقات بہت محدود ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اگر سبھی مسلمانوں کے تجارتی یا پیشہ ورانہ تعلقات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے جتنے تعلقات ہندوؤں سے ہیں ان کے آپس میں نہیں ہیں۔

لیکن یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ ان تجارتی تعلقات سے سماجی دوری خود بخود کم نہیں ہو جاتی ڈاکٹر گپتا کا خیال ہے کہ بین مذہبی تعلقات میں تعصب یا دشمنی کا کم یا زیادہ ہونا درج ذیل باتوں پر منحصر ہے:-

(۱) عام طور پر ایسے تجارتی تعلقات میں اونچ نیچ کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یہ تجارتی تعلقات آسانی سے سماجی اور ذاتی تعلقات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اگر مختلف گروہوں کے ان افراد کا تعلق ایک ہی طبقے سے ہو یا ان کی سماجی حیثیت برابر ہو اور ان کے مفادات اور سماجی ذوق میں کوئی خاص فرق نہ ہو۔

(۲) مسلمانوں کی اکثریت مقامی ہندوؤں سے قریبی خاندانی تعلق رکھتی ہے اور اس طرح ابتدائی تعصب اور عناد پہلے ہی سے بہت کم ہے۔

(۳) جس سماجی دائرے میں یہ تعلقات قائم رہتے ہیں اس کی خاصیت یا تعصب اور اس کا

پھیلاؤ کافی اہم ہوتا ہے۔ دہرہ دون کم تناؤ والا علاقہ ہے۔ اس علاقے کے مسلمانوں میں مقامی ہندوؤں کے خلاف بہت کم تعصب پایا جاتا ہے۔ ہاں اگر تعصب ہے تو مہاجر ہندو۔ سکھوں کے خلاف۔

(۴) مسلمانوں کے مقامی ہندوؤں سے تعلقات پرانے ہیں جبکہ مہاجرین سے نئے نئے۔

(۵) غیر مسلم۔ مسلمانوں کے تجارت یا دوسرے پیشوں میں حریف نہیں ہیں۔ عام طور پر وہ ان دائروں میں ایک دوسرے کے معاون ثابت ہوتے ہیں اور اس طرح ان فرقوں کے مابین اچھے تعلقات کی فضا بنی رہتی ہے۔

(۶) بہت کم مسلمان ایسے ہیں جن کے تجارتی تعلقات یا لین دین ہندوؤں سے نہ ہوں، اس طرح دونوں فرقوں کے تعلقات میں دن بدن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اعداد و شمار کی اگر بات کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دہرہ دون کا ایک بھی مسلمان مقامی ہندوؤں کو ناپسند نہیں کرتا۔ مگر مہاجر ہندوؤں کی بات الگ ہے اوپری طبقے کے ایک اور درمیانی طبقے کے دو مسلمانوں نے مہاجروں کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مگر نچلے طبقہ کے مسلمانوں میں مہاجرین کے خلاف ناپسندیدگی کا یہ جذبہ بڑھتا جاتا ہے۔ ان میں سے تقریباً ۱۱ فی صد مسلمان سکھوں اور ہریجنوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ حالانکہ اس طبقہ کے مسلمانوں کا ان سکھوں اور ہریجنوں سے رات دن لین دین کا تعلق بنا رہتا ہے۔

ہندو مسلم تعلقات کا ایک قابل اعتبار پیمانہ یہ بھی ہے کہ وہ شادی بیاہ، تہواروں وغیرہ کے موقعوں پر کس حد تک شرکت کرتے ہیں؟ اس سے گہرے رشتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے — دہرہ دون میں کئی ہندو، مسلم خاندانوں میں آپسی تعلق اتنا گہرا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے رشتے داری کی اصطلاحوں کا استعمال کرتے ہیں مثلاً تاؤ، چچا، بھائی، ماں وغیرہ۔ یہ تعلق برابر کا ہوتا ہے۔ اور جس شخص نے یہ تعلق قائم کیا تھا اگر وہ مر بھی جائے تو قائم رہتا ہے۔ بلکہ یہ رشتے داری وراثت میں چلتی رہتی ہے۔ دراصل اس کی ابتدا دیہاتوں میں ہوئی تھی۔ جہاں سے آ کر یہ لوگ شہر میں آباد ہوئے۔

تقسیم وطن سے پہلے اوپری طبقے کے تمام مسلم خاندانوں اور درمیانے اور نچلے طبقے کے اکثر مسلم خاندانوں کے ایک یا زیادہ ہندو خاندانوں سے ایسے گہرے تعلقات تھے۔ ۱۹۴۷ء کے

المناک حادثے میں ۱۳ فی صد خاندانوں کے تعلقات ٹوٹ گئے۔ مگر آج بھی تقریبًا ۶۹ فیصد ہندو مسلم خاندانوں میں ایسے تعلقات موجود ہیں اور یہ ان تعلقات کی گہرائی اور قوت کی باوثوق دلیل ہے۔ مگر اس کا ایک پہلو ہے جو صحت مند نہیں کہا جا سکتا۔ یعنی یہ کہ تعلقات محض اونچی ذات کے ہندوؤں تک محدود ہوتے ہیں ان میں ہریجن شامل نہیں ہیں۔ آیئے اعداد و شمار پر ہم ایک نظر ڈالتے ہیں۔

درمیانے اور نچلے طبقے کے مسلمانوں کے مقابلے میں اوپری طبقے کے مسلمانوں کے مقامی ہندوؤں مہاجرین، سکھوں، ہندوؤں اور عیسائیوں سے تعلقات سب سے زیادہ ہیں۔ درمیانہ طبقے کے مسلمانوں میں مہاجر ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف سب سے زیادہ مقاومت کا جذبہ پایا جاتا ہے اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ڈاکٹر گپتا کے سروے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا یہ درمیانی طبقہ مہاجرین سے بزنس کامپیٹیشن میں سب سے زیادہ نقصان اٹھا چکا ہے۔ پھر بھی یہ بات اہم ہے کہ جن مسلمان خاندانوں کو اس سروے میں شامل کر لیا تھا ان میں سے ۳۰ فیصد آپس میں گہرے خاندانی تعلقات رکھتے ہیں۔ وہ مسلمانوں سے تعلقات بہتر بنانے اور استوار کرنے میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ مسلمانوں سے زیادہ سماجی دوری نہیں رکھنا چاہتے شاید وہ پنجاب اور شمال مغربی صوبے میں مسلمانوں کے ساتھ ایسے تعلقات کے عادی تھے۔

ہندوؤں کے مقابلے میں دہرہ دون کے مسلمانوں کے سکھوں اور عیسائیوں سے تعلقات کم ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے بلکہ ایسا آپسی میل ملاپ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہریجنوں سے مسلمانوں کے تعلقات شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ نچلی ذات کے خلاف ان میں بھی سماجی تعصب پایا جاتا ہے۔ ہریجنوں میں تعلیم کے پھیلاؤ کے باوجود انہیں آج بھی خاندانی سطح کے تعلقات کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔

شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش کے موقعوں پر ایک دوسرے کو دعوت دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اگر ایسے موقعوں پر دعوت نہ دی جائے تو بُرا مناتے ہیں۔ اگر ایک خاندان' دوسری طرف سے ایسے موقعوں پر دعوت نہ آنے کے باوجود' اس خاندان کو اپنے یہاں مدعو کرتا رہے تو اسے آپسی تعلقات برقرار رکھنے کی بے چینی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پچھلے دس سالوں میں بہت کم ہندو خاندان ایسے ہیں جنہیں دوسری اور سے دعوت نہ دی گئی ہو۔ مگر کئی مسلم خاندان ایسے ہیں جنھیں اب

ہندو خاندانوں کی طرف سے مدعو نہیں کیا جاتا۔ اس کی بنیادی وجہ ۱۹۴۷ء کا فرقہ وارانہ فساد بتایا جاتا ہے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اوپری طبقوں میں ایسے تعلقات زیادہ تر سطحی اور رسمی ہوتے ہیں۔ مگر نچلے طبقوں میں زیادہ تر گہرے اور دیرپا۔

اکثر مسلم خاندانوں نے ہندوؤں کی طرف سے اہم مواقع پر مدعو نہ کیے جانے کے باوجود ان خاندانوں سے اپنے مراسم قائم کر رکھے ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر مسلمان ہندوؤں سے اپنے تعلقات برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہاں بھی طبقاتی فرق نمایاں ہے۔ اوپری طبقے کے مسلمان ہندوؤں سے سمبندھ بنائے رکھنے کے سب سے زیادہ خواہشمند ہیں اور درمیانہ درجے کے مسلمان سب سے کم۔ اوپری طبقے کے اور نچلے طبقے کے مسلمان مدعو نہ کیے جانے کی توہین برداشت کیے جانے پر زیادہ نظر آتے ہیں۔

ایک مزے کی بات یہ ہے کہ بچپن میں ساتھ کھیلنے والے بچے خاندانی تعلقات پیدا کرنے میں بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے سمبندھ اکثر اٹوٹ بن جاتے ہیں اور ساتھ کھیلنے والے بچے اپنے ساتھی بچے کے خاندان کے لوگوں کو انھیں رشتے داریوں سے یاد کرتے ہیں۔ بڑھتی تعلیم نے ان مواقع کو اور بڑھا دیا ہے اور زیادہ تعداد میں اب مختلف فرقوں کے بچے ایک دوسرے سے قریب آنے لگے ہیں۔

ایک دلچسپ معاملہ دوستی کا بھی ہے۔ اپنا بہترین دوست کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے؟ ڈاکٹر گپتا نے جو اعداد و شمار جمع کیے ہیں وہ یوں ہیں: تقریباً ۲ ۵ فیصد مسلمان اپنے دوست اپنی ہی کمیونٹی میں سے چنتے ہیں۔ اوپری طبقے سے نچلے طبقے میں یہ رجحان بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اوپری طبقے میں سب سے زیادہ ہندو دوست پائے جاتے ہیں۔ مہاجرین سے بھی دوستی کا رجحان مسلمانوں میں بڑھ رہا ہے۔ اس معاملہ میں بھی اوپری طبقہ سب سے آگے ہے۔ نچلے طبقے کے مسلمان اس معاملے میں زیادہ لبرل پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۱۲ فیصد مسلمانوں کے بہترین دوست مہاجرین کمیونٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ درمیانہ طبقے کے بہت کم مسلمانوں کے دوست مہاجرین خاندانوں سے ہیں۔

ساتھ کھانا پینا ہندوؤں میں بھی اور مسلمانوں میں بھی قریبی اور ذاتی تعلقات پر منحصر ہوتا

ہے، جو کھانے پینے میں شریک ہو اس کا درجہ بھائی کے برابر ہوتا ہے۔ دہرہ دون کے مسلمانوں کی خاصی تعداد (تقریباً ۴۵ فیصد) ہندوؤں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ کھانے پینے میں شریک ہوتی ہے کئی مسلمان موقع ملنے پر ساتھ کھانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہیں۔ آدھے سے کچھ کم بالغ مسلمان ہندوؤں کے ہم نوالہ ہیں۔ اس سے کچھ کم تعداد مہاجرین سے ایسے تعلقات رکھتی ہے اور سکھوں سے اس سے بھی کم۔ عیسائی اور ہریجن سے تو اس سے بھی کم۔

دہرہ دون کے مسلمان ہندوؤں کے متعلق کیا خیالات رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت مقامی ہندوؤں کو دل سے چاہتی ہے۔ اور درج ذیل ۹ خوبیاں ہیں۔ (جو علی الترتیب ہیں) ان میں انھیں نظر آئی ہیں؛ (۱) لین دین میں نرم گفتاری (۲) مسلمانوں کے ہمدرد (۳)، سادہ اور سنجیدہ زندگی (۴)، اچھے اخلاق (۵) اچھے پڑوسی (۶)، شریف (۷)، مہربان (۸)، مہمان نواز اور (۹)، صاف ستھرے۔

پانچ باتیں جو چند مسلمان ہندوؤں میں ناپسندیدگی سے دیکھتے ہیں علی الترتیب حسب ذیل ہیں؛

(۱)، ہندوؤں کی مسلمانوں سے نفرت (۲)، نوکری یا کام کاج دینے میں مسلمانوں سے تعصب (۳)، لین دین میں بے ایمانی (۴)، ہندو عورتوں کا پردہ نہ کرنا اور (۵)، دوسروں کے ساتھ کھانا کھانے میں اعتراض۔

یہ اور اس قسم کی بہت سے دوسری دلچسپ باتیں اعداد و شمار کے ساتھ اس کتاب میں پائی جاتی ہیں جو فاضل مصنف نے ۱۰ سال کی محنت کے بعد ترتیب دی ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ہندو مسلم تنازعہ کا بھی عمرانیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ (فروری ۱۹۷۷ء)

آر ایس ایس اور ہندوستانی مسلمان

ہمارا ملک اس وقت سیاسی اعتبار سے بڑے نازک دور سے گذر رہا ہے۔ دراصل اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ایمرجنسی نے ہمارے سیاسی کلچر میں ایک نیا موڑ پیدا کر دیا ہے آزادی کے بعد ہم نے شعوری طور پر سیکیولر اور جمہوری نظام اختیار کیا۔ جمہوریت اور سیکیولرزم ہمارے مزاج اور سیاسی کلچر کا قابل قدر حصہ بن گئے۔ ایمرجنسی نے اگر سیکیولرزم نہیں تو جمہوریت کی قدر کو زبردست ٹھیس پہنچائی۔ دراصل آزاد ہندوستان میں یہ ایمرجنسی جمہوری اقدار کو ختم کر کے ذاتی مطلق العنان حکومت قائم کرنے کی پہلی شعوری کوشش تھی اور اسی معنی میں اسے ہمارے ملک کے سیاسی کلچر میں ایک نیا موڑ قرار دیا جائے گا۔ ایمرجنسی جیسے ہمارے جنتا لیڈر بار بار دہراتے ہیں، سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے اقتدار کی ہوس کا ہی نتیجہ نہیں تھی نہ ہی یہ کوئی اتفاقی سانحہ تھا۔ دراصل یہ ایسا پیچیدہ سیاسی واقعہ تھا جس کے پیچھے معاشی عوامل اور سرمایہ دارانہ نظام کا قابو میں نہ آنے والا بحران بھی کارفرما تھا۔ پچھلے تیس سال کے ترقیاتی منصوبوں نے جہاں اوپری طبقوں کی معاشی کایا پلٹ کر دی وہاں پس ماندہ طبقوں میں سیاسی شعور بھی پیدا کر دیا نچلے طبقے کے لوگ اب نیند سے بیدار ہو چکے تھے۔ اور ہر حال پر صابر و شاکر رہنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

یہی وجہ تھی کہ ایمرجنسی سے پہلے ملک میں ایک بے چینی کی لہر پھیلی ہوئی تھی اور احتجاجی تحریکیں زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ اندرا گاندھی نے ۱۹۶۹ء میں غریبی ہٹاؤ کا نعرہ لگا کر ملک کے پس ماندہ طبقوں میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی تھی اور بینکوں کو قومی ملکیت قرار دیکر ان کی معاشی امنگوں کی بھی پینگ بڑھائی تھی۔ یہ سب کچھ کر کے اندرا گاندھی نے اقتدار تو حاصل کر لیا مگر عوام کے مسائل

حل نہیں کرسکیں اور جب عوام کا دباؤ بڑھا تو ایمرجنسی نافذ کرکے اپنا اقتدار بچانا چاہا۔ یہ نہ صرف اپنا ذاتی اقتدار بچانے کی کوشش نہی بلکہ حکمراں طبقے کا اقتدار بچانے کی بھی کوشش تھی اور یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں نے ایمرجنسی کی حمایت کی۔ ایمرجنسی کو سمجھنے کے لیے ان معاشی عوامل اور ان سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کسی بھی بحران کا حل تلاش کرنے کے لیے پورے حکمراں طبقے کا ہر اعتبار سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ جن سنگھ اور آر ایس ایس بھی ہندوستان کے سرمایہ دار حکمراں طبقے کی نمایندگی کرتی ہیں یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ جن سنگھ اور آر ایس ایس ایمرجنسی کے سخت خلاف تھے اور اس کی مخالفت میں ان دونوں جماعتوں نے عملی سرگرمی بھی دکھائی۔ آر ایس ایس ــ اور جن سنگھ جو اس کی سیاسی نمائندگی کرتی ہے ــ ایک خاص سیاسی مذہبی نظریے کی حامی ہے جو جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ آر ایس ایس دائیں بازو کی ایسی جماعت ہے جو ہندو راشٹر کو اپنے سیاسی نظام کو بنیاد بنانا چاہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کا سیاسی کلچر سیکیولر قدروں کی اہمیت سے انکار کرتا ہے۔ اِس جماعت کے نظریے کے مطابق ہندو داخلی طور پر ایک ہم آہنگ قوم ہیں اور ہندو مذہب کے ماننے والے ہی ایک ایسی سیاسی قوم (پولٹیکل نیشن) بنا سکتے ہیں جو ہر طرح کے بحران اور سماجی تناؤ سے پاک ہوگی دوسرے مذہب کے ماننے والے جس میں مسلمان اور عیسائی خاص طور سے شامل ہیں اپنے مذہبی عقائد کی وجہ سے ہندو قوم سے کبھی ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتے، ہندو قوم اور ہندوستان کی طرف ان کی وفاداریاں بھی مشکوک ہیں اور سماجی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے یہ ملک کے لیے ہمیشہ ایک مسئلہ بنے رہیں گے۔ گرو گوالکر جنھوں نے آر ایس ایس کی نظریاتی بنیاد رکھی، مشترکہ ارضی قومیت (COMMON TERRITORIAL NATIONALISM) کے خلاف تھے، ان کے خیال سے قومیت کی بنیاد ہندو مذہب ہو سکتی ہے۔ سیکیولر قومیت ایک غلط تصور ہے۔ یہ بات ان کی مشہور کتاب A BUNCH OF THOUGHTS سے بالکل واضح ہے۔ وہ اقلیتوں کو یا تو مہمان سمجھتے ہیں جیسے کہ پارسی، یا حملہ آور تصور کرتے ہیں جیسے کہ مسلمان۔ یہ مہمان یا حملہ آور اس قومی دھارے کا حصہ ہرگز نہیں بن سکتے۔ اگر انہیں ہندوستان میں رہنا ہے تو یا تو ہندو مذہب اختیار کرنا ہوگا یا "ہندوانہ" (HINDUISATION) ہوگا ہندوانے سے ان کی مراد ہندو مذہب، ہندو تاریخ، ہندو عقائد

ہندو روایت کا احترام اور علیحدہ مذہبی یا تہذیبی شناخت کو ختم کر دینے سے ہے۔ گرد گولوالکر اپنی اس کتاب میں مسلمانوں کو نہ صرف حملہ آور بلکہ ہندو مندروں کو توڑنے اور ہندو عورتوں کی عصمت دری کرنے والے قرار دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جن سنگھ اور آر ایس ایس نے ہمیشہ بحرانی دور میں مسلمانوں کو سماجی تناؤ اور معاشی مسائل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جب ہندوستان معاشی بحران سے گذر رہا تھا۔ فرقہ وارانہ تناؤ بھی بڑھتا گیا۔ ۱۹۶۷ء کے بعد جب بائیں بازو کی طاقت کسی حد تک بڑھ رہی تھی اور ملک میں سماج واد کا چرچا تھا۔ جن سنگھ نے اپنے پٹنہ کے اجلاس میں ہندو آنے والی تجویز پاس کی اور مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کرنے کا پروپیگنڈہ زور شور سے چلایا۔ بعض اعداد وشمار سے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کی وجہ ہے مسلمانوں میں چار شادیوں کا رواج اور خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت" مسلمانوں کی اس بڑھتی ہوئی آبادی" کو یہاں کی غریبی کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حکمراں طبقے کا ایک حصہ ملک کے معاشی بحران کے لیے اقلیتی فرقہ کو ذمے دار ٹھہرا رہا تھا۔ اور انتقامی کارروائی پر بھی تلا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ اس عرصے میں ہولناک فسادات ہوئے (احمد آباد، بھیونڈی، جلگاؤں وغیرہ میں)

لیکن چونکہ معاشی بحران کا یہ اصلی سبب نہیں تھا (اس بحران کی جڑیں تو سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی لوٹ کھسوٹ میں پیوست تھیں) آخر کار اس سے نمٹنے کے لیے حکمراں طبقے کو ڈکٹیٹرشپ کا آخری ہتھیار استعمال کرنا پڑا اور ۱۹۷۵ء میں اس ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ مگر ایمرجنسی نے کئی مسائل پیدا کر دیئے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ حکمراں طبقے کا ایک حصہ برسراقتدار رہنے کے لیے دوسرے حصے کو سختی سے دبا رہا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ ہزاروں سیاسی کارکنوں اور لیڈروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا شمالی ہند میں چونکہ جن سنگھ اور آر ایس ایس کا اثر زیادہ تھا اس لیے اندرا حکومت نے ایمرجنسی کا سہارا لے کر ان کو کچلنے کی کوشش کی تاکہ اقتدار پر اس کا مضبوطی سے قبضہ ہو جائے دوسری طرف معاشی مسائل حل کرنے میں ناکامی اور زبردستی کی جانے والی نس بندی کی مہم نے عوام میں زبردست بے چینی پیدا کر دی۔ ان مسائل سے نمٹنا برسراقتدار پارٹی کے لیے ناممکن ہو گیا۔

لوک سبھا کے چناؤ کا اعلان ہوتے ہی ملک میں سیاسی کھلبلی مچ گئی مخالف پارٹیوں نے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے میں ضم ہو کر متحدہ جماعت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایمرجنسی جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ہمارے سیاسی کلچر میں ایک موثر ثابت ہوئی۔ نہ صرف جمہوریت کی اہمیت ثابت ہوئی بلکہ سیکیولرزم کا احترام بھی بڑھ گیا یہاں تک کہ جن سنگھ اور آر ایس ایس جیسی فرقہ وارانہ ذہنیت کی حامل جماعتیں بھی سیکیولرزم کی اہمیت تسلیم کرنے لگیں۔ لیکن میرا خیال ہے۔ اور اکثر سیکیولر سیاست کے حامی اس خیال سے پورا اتفاق کریں گے کہ آر ایس ایس نے سیکیولرزم کو عقیدے کے طور پر نہیں بلکہ حکمت عملی (STRATEGY) کے طور پر قبول کیا ہے اور حالات بدلنے پر یہ حکمت عملی بدل سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی بڑے بڑے سیاست داں آج بھی آر ایس ایس کو مستقبل کے لیے خطرہ تصور کرتے ہیں۔ خود جنتا پارٹی کے مدھیہ پردیش شاخ کے جنرل سکریٹری اور مدھیہ پردیش اسمبلی کے ایم ایل اے رگھوٹھاکر نے دہلی میں آر۔ ایس۔ ایس کے کردار پر منعقد کیے گئے سیمینار میں اس پر زبردست حملہ کیا۔ اس سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے رگھوٹھاکر نے کہا ماضی میں (مراد ایمرجنسی سے ہے) جو کچھ ہوا اسے بھول جائیے کیونکہ آر۔ ایس۔ ایس کا آج اور مستقبل میں جو خطرہ ہے وہ اتنا گمبھیر ہے، اتنا تشویش ناک ہے کہ ہمارے لیے آپسی اختلافات میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔ اندرا گاندھی نے تو چناؤ کرائے اور اس چناؤ کے ذریعے اسے اقتدار سے ہٹانا ممکن ہو سکا۔ چناؤ اس نے چاہے غلطی سے ہی کیوں نہ کرائے ہوں، لیکن آر ایس ایس اس قسم کی غلطی کبھی نہیں کرے گی۔ اگر آر ایس ایس کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہوئی تو اُسے بندوق کی گولی سے ہی بدلا جا سکے گا۔"

یہاں اس بات کا بھی ذکر ضروری ہے کہ ایمرجنسی اور اس کے بعد ہونے والے لوک سبھا چناؤ میں مسلم ووٹوں کی اہمیت نے آر ایس ایس کے کچھ لوگوں کی ذہنیت میں ایک حد تک تبدیلی ضرور پیدا کی ہے۔ اس سلسلے میں آرگنائزر کے ایڈیٹر ملکانی کی کتاب "(KNOCK AT MIDNIGHT) (دستک نیم شب)" کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ آج تک گورو گولوالکر اور ان کے ماننے والے یہ کہتے رہے ہیں کہ مسلمان نہ صرف حملہ آور تھے بلکہ لٹیرے مندر ڈھانے والے اور ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے والے تھے مسلم حکمرانوں کی تاریخ کو اس طرح سے توڑ مروڑ کر پیش کرتے رہے ہیں کہ

مندرجہ بالا الزامات ثابت کیے جاسکیں چند واقعات کو سیاق و سباق سے ہٹا کر اچھالا جاتا رہا اور حکمرانوں کی تاریخ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل جنگ کی تاریخ بن کر رہ گئی۔

ملکانی نے اپنی کتاب میں پہلی مرتبہ اس سے ہٹ کر اس دور کے تاریخی واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ نہ صرف محمود غزنوی بلکہ اورنگ زیب کو بھی ان الزاموں سے بری کیا ہے جو ہماری تاریخ کی کتابوں میں عام طور پر ان پر لگائے گئے ہیں۔ ملکانی کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے کہ اورنگ زیب ہندو مندروں کو مسمار کرنے کی پالیسی پر عمل کرتا تھا۔ کئی دستاویزیں اس کے برخلاف یہ ثابت کرتی ہیں کہ اورنگ زیب نے مندروں کو جاگیریں عطا کیں تاکہ ان کے مصارف پورے کیے جاسکیں۔ شیواجی اور اورنگ زیب کی لڑائی بھی سیاسی نوعیت کی تھی نہ کہ مذہبی نوعیت کی۔ ماضی میں آرگنائزر اس دور کی تاریخ پر جس قسم کے مضامین لکھتا رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس کے ایڈیٹر ملکانی کا رویہ واقعی ایک خوش گوار تبدیلی کی نشاندھی کرتا ہے اور ہر معقول ہندوستانی کو ایسی تبدیلی کا دل سے استقبال کرنا چاہیے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تبدیلی آر ایس ایس کے نظریے میں بنیادی تبدیلی کی جانب پہلا قدم ہے؟ میرے خیال سے ایسا کوئی نتیجہ اخذ کرنا مشکل نظر آتا ہے ملکانی آرگنائزر کے ایڈیٹر ضرور ہیں مگر آر ایس ایس کی تنظیم میں کسی اہم عہدے پر نہیں ہیں نہ ہی وہ اس کے نظریہ سازوں میں شمار ہوتے ہیں آر ایس ایس کے کسی لیڈر نے ابھی تک کوئی ایسا بیان دیا ہے نہ اس سلسلے میں کچھ لکھا ہے تاریخ کی درسی کتابیں جس میں تاریخی واقعات کا سیکولر نظریئے سے تجزیہ کیا گیا تھا جس طرح واپس لے لی گئیں اس سے تو کچھ اور ہی ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات کئی لوگ بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ ان درسی کتابوں کو واپس لینے میں ایسے شخص کا ہاتھ ہے جو آج جنتا پارٹی کا عہدیدار ہے اور کل تک آر ایس۔ ایس کی تنظیم میں اہم حیثیت رکھتا تھا۔

اور بھی شہادتیں ایسی ملتی ہیں جس سے آر۔ ایس۔ ایس کے بنیادی نظریے میں کسی تبدیلی کا امکان نظر نہیں آتا۔ حال ہی میں آر۔ ایس۔ ایس کے ترجمان ہندی اخبار پنچ جنیہ میں (دیکھیے ۱۸ فروری کا شمارہ) ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ "سیکیولرازم اور سوشلزم جیسے مادیت پرست نظریے انسانی زندگی کو بلند سطح پر نہیں پہنچا سکتے۔" آگے چل کر اس مضمون میں کہا گیا

ہے کہ "ہندوستان میں قومیت کے سوال پر غور کرتے وقت یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اس ملک میں پچھلے پانچ ہزار سال سے ہندو سماج آباد رہا ہے..... یونان، اشاکیہ اور ہُن حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوؤں نے اپنے آپ کو منظم کیا۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی ایک طاقتور قوم آباد تھی۔ اس قوم کو بنانے والے ہندو تھے.... اس لیے بھارت ہندو راشٹر ہے۔" آگے چل کر پنج جنیہ کے اس مضمون میں اور بھی چونکا دینے والی باتیں کہی گئی ہیں مثال کے طور پر مضمون نگار کہتا ہے کہ "رابندر ناتھ ٹیگور، اروبندو گھوش، تلک وغیرہ جیسے لیڈر قدیم ہندوستانی سیاست کے حامی تھے اور اس قدیم نظام میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ سوراجیہ کی جانب قدم بڑھا سکے۔ اس کے برخلاف کچھ لوگ ایسے تھے جو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں (یعنی غیر ہندوؤں) کو بھی شامل کر کے قومی وحدت کی تنظیم بنانا چاہتے تھے۔ (یہاں جواہر لال نہرو، گاندھی وغیرہ جیسے لیڈروں کی طرف اشارہ ہے جو سیکیولر قومیت کے قائل تھے۔)

آر ایس ایس آج بھی ہندو راجیہ دیوس جسے ان کی اصطلاح میں شیو راجیہ ابھشیک کہا جاتا ہے مناتی ہے۔ حال ہی میں السٹریٹیڈ ویکلی کو انٹرویو دیتے ہوئے شری دیورس نے اس کے متعلق کہا ہے کہ "..... پچھلی کئی صدیوں سے یہاں راجپوت تھے اور ان کی بڑی بڑی فوجیں تھیں اور یہی راجپوت مسلم حکومتوں کے دہلی میں علمبردار تھے۔ انہوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ خود ہندو اس ملک پر حکومت کر سکتے ہیں۔ اس دور میں ہندو اس قدر پست ہمت ہو گئے تھے کہ انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ وہ دوسرے بادشاہوں کی مدد کرتے ہیں تو خود اپنی بھی حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ ہندوؤں کے اس منفی احساس اور پست ہمتی کو دور کرنا ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیواجی کے مشیروں نے انھیں تاجپوشی کا مشورہ دیا۔ آج ہم یہی محسوس کرتے ہیں۔ ہندوؤں کو یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ وہ اس ملک میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ ان میں عزت نفس کا جذبہ پیدا کرنا ضروری۔"

گویا دیورس صاحب آج بھی ماضی کا احساس سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور اس احساس کو زندہ رکھنے کے لیے وہ یہ دن منانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں میں خودداری اور عزت نفس کے احساس کی کمی ہے اور یہ احساس پیدا کرنا آر۔ ایس۔ ایس کا فرض ہے۔ قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ آج سیکیولر اور جدید ہندوستان میں یہ باتیں

کہاں تک قابل قبول ہوسکتی ہیں اور یہ کہ ایسی ہندوانہ ذہنیت رکھنے والی تنظیم کس طرح اقلیتوں کو اپنا ہم پلہ تسلیم کرسکتی ہیں۔ یہ باتیں۔ دراصل سیکیولرازم کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والی ہیں۔ ایمرجنسی نے جمہوری اور سیکولر قدروں کو ضرور اُبھارا ہے۔ لیکن اگر جنتا پارٹی معاشی سوالات حل کرنے میں ناکام رہی (ابھی تک تو یہی آثار نظر آرہے ہیں) اور اقلیتوں کے مسائل پر توجہ نہیں دی تو نہ صرف ان کا اعتماد کھودے گی بلکہ آر ایس ایس جیسی تنظیموں کو قابو میں رکھنے میں ناکام ہوجائے گی معاشی بحران پیدا ہونے پر ایسی تنظیمیں جذباتی نعرے لگاکر ملک میں خطرناک صورت حال پیدا کرسکتی ہیں جیسا کہ ۱۹۶۹ء - ۷۰ میں ہوا۔ اور اس میں شک نہیں کہ ایسی صورت حال دوسری ایمرجنسی کا ایسا جواز پیدا کرسکتی ہے، جس کی طرف رگھوٹھاکر نے اپنی مندرجہ بالا تقریر میں اشارہ کیا ہے۔

(اپریل ۱۹۷۸ء)

مسلمانوں کے مسائل

اور قومی اخباروں کی خاموشی

دیسے تو ہندوستان کی بڑی بھاری اکثریت کو طرح طرح کے سماجی اور معاشی مسائل کا سامنا ہے لیکن عام طور پر یہ بات سنجیدہ حلقوں میں تسلیم کی جاتی ہے کہ اقلیتوں اور اچھوتوں کے اپنے مسائل ہیں جو نفسیاتی اور مادی دونوں اعتبار سے زیادہ پیچیدہ اور گہرے ہیں اور اسی لیے وہ تمام مسائل کے مقابلے میں زیادہ توجہ چاہتے ہیں۔ اور اقلیتی کمیشن کا تقرر بھی اسی وجہ سے عمل میں آیا ہے۔

سیاسی جماعتوں اور حکومت کا اس سلسلہ میں جو رول رہا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ سیاسی جماعتوں نے اور حکومت نے جن میں کانگریس اور جنتا دونوں ہی شامل ہیں اقلیتوں کے مسائل کے سلسلے میں ٹھوس قدم مشکل سے اٹھائے ہیں۔ صرف ووٹ حاصل کرنے کے لیے دلفریب وعدے ہی کیے ہیں۔ اقلیتی کمیشن اور حکومت کا رویہ اس کی تازہ ترین مثال ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کمیشن حکومت نے پچھلے لوک سبھا کے موقع پر مسلمانوں سے کیے گئے وعدے کو کسی طرح نبھانے کے لیے مقرر کیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ کمیشن کے چیرمین اور ممبروں کا انتخاب کچھ اس طرح ہوا ہے کہ مسلمان کچھ خوش نہیں ہیں۔ مینو مسانی اور وی۔ وی جون مسلمانوں سے ہمدردی ضرور رکھتے ہوں گے۔ لیکن ماضی میں انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل میں نہ کبھی گہری دلچسپی لی نہ ہی ان مسائل سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ دوسرے ابتدا ہی سے کمیشن اور حکومت میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جن کی نوعیت بنیادی ہے، یہاں تک کہ نوبت استعفے تک پہونچی۔ (کل ہی خبر آئی ہے کہ مینو مسانی اور وی۔ وی جون دونوں نے استعفے دے دیا ہے)، کمیشن ان حالات میں کہاں تک کامیابی کے ساتھ کام کر سکے گا اور مسلمانوں کے بنیادی مسائل پر کس حد تک حکومت اور عوام کی توجہ مبذول کرا سکے گا۔ (ان مسائل کو حل کرنا تو حکومت اور مسلم عوام کا ہی کام ہے۔ کسی کمیشن کا نہیں) کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔

کسی بھی صحت مند جمہوریت (ایمرجنسی والی جمہوریت نہیں) کی بقا کے لیے ذرائع اطلاعات ونشریات (جسے آج کل عرفِ عام میں میڈیا کہا جاتا ہے) کی اہمیت بنیادی ہوتی ہے۔ ہمارے اس دیش میں جس کی ذہنی مفاہمت پسندی ضرب المثل سمجھی جاتی ہے۔ ہریجنوں پر صدیوں سے ظلم ہو رہا ہے۔ لیکن عوام میں اس کے متعلق اتنی آگاہی نہیں تھی۔ لیکن شکر ہے اس ماس میڈیا کا کہ آج یہ ہمارے سماج کا نازک ترین مسئلہ بن چکا ہے۔ اخباروں میں ہریجنوں اور اچھوتوں کے مسائل پر روزانہ مضامین خطوط اور اداریئے شائع ہوتے ہیں اور اس طرح ان ناانصافیوں کے خلاف عوام میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ دوسری جمہوری ذرائع سے حکومت پر ان ناانصافیوں کو ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔

ہریجنوں کی طرح مسلمانوں کے بھی اپنے مسائل ہیں۔ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہوتے ہوئے بھی دوسری اقلیتوں، جیسے کہ پارسی سکھ عیسائی وغیرہ کے مقابلے میں سب سے زیادہ پچھڑی ہوئی ہے۔ اور اسی پچھڑے پن کی وجہ سے اس کے ساتھ سب سے زیادہ سیاسی اور معاشی ناانصافیاں ہوتی ہیں۔ اور فرقہ وارانہ فسادات (جس کی پچھلے دنوں پھر ایک لہر چل پڑی تھی) کا بھی خطرہ منڈلاتا رہتا ہے۔ لیکن قومی اخباروں میں مسلمانوں کے ان مسائل اور ناانصافیوں کے متعلق کتنے مضامین۔ یا خطوط یا اداریئے شائع ہوئے ہیں۔؟ اب بھی ان اخباروں میں چھپنے والے زیادہ تر مضامین کی نوعیت متعصبانہ ہوتی ہے۔ یا کم از کم ان مضامین کا رویہ ہمدردانہ کم اور ناصحانہ اور معاندانہ زیادہ ہوتا ہے۔ ان مضامین کو پڑھکر ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان ایک نہایت جارحانہ قوم ہے جس پر مُلّاؤں کا تسلط ہے۔ اور اس سے مذہب کی اندھی تقلید کے علاوہ کوئی زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی (اس بات میں ایک حد تک۔ صرف ایک حد تک۔ سچائی ضرور ہے۔ لیکن اس کی نوعیت سمجھنے کے لیے ہمدردانہ مگر غیر جانبدارانہ تجزیے کی ضرورت ہے)،

ان مضامین کو پڑھ کر ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان یا تو ایک جنگجو اور مذہبی جنون میں مبتلا قوم ہے یا یہ کہ ان کے مسائل محض مذہبی یا ذاتی نوعیت لئے ہوئے ہیں۔ اور معاشی اور سیاسی مسائل گویا وجود ہی نہیں رکھتے۔ یہاں یہ بات کہنا مناسب ہوگا کہ ایسا تاثر پیدا کرنے کی ذمہ داری ایک حد تک آج کی موقع پرست مسلم لیڈرشپ پر بھی عاید ہوتی ہے جو مسلم پرسنل لاء کو ہندوستانی مسلمانوں کا اہم ترین مسئلہ بنائے ہوئے ہے۔ اور جس نے روزی روٹی اور سماج میں باعزت زندگی گذارنے کے مسائل کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ لیکن بہرحال ان اخباروں کی ذمہ داری اس سے

کم نہیں ہوتی۔ آج ہمیں ہندوستان کے کتنے بڑے اخباروں میں (جیسے ٹائمز آف انڈیا، انڈین ایکسپریس، ہندوستان ٹائمز، ہندو، اسٹیٹسمین یا دوسری زبان کے اخبار و رسائل) مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل پر مضامین ملتے ہیں۔ کتنے اخبار و رسائل نے یہ سروے کیا کہ مسلمانوں کو اپنی آبادی کے تناسب سے سرکاری اور غیر سرکاری نوکریاں ملتی ہیں یا نہیں۔ پرائیوٹ سیکٹر میں مسلمانوں کو کتنی درمیانہ یا اعلیٰ سطح کی آسامیاں ملتی ہیں (پرائیوٹ سیکٹر میں، میری اطلاع کے مطابق، ٹاٹا، گودریج یا چند غیر ملکی اشتراک سے چلنے والی کمپنیوں کو چھوڑ کر عام طور پر مسلمانوں کو درمیانہ یا اعلیٰ سطح کی نوکریاں ملنا بڑا دشوار ہے)؟ کتنے اداریئے یا خطوط ان مسائل کو لے کر لکھے گئے۔ کشمیر سے کنیا کماری تک کے اخبارات و رسائل اٹھا کر دیکھ لیجئے، جواب نفی میں ہوگا۔

یہاں میں ایک دلچسپ واقعہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو بنگلور کے میرے ایک دوست کے ساتھ پیش آیا اور جو مسلمانوں کی طرف ہمارے اخبارات کے رویّہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ راج شیکھر شیٹھی بنگلور کے مشہور صحافی ہیں اور کئی انجمنوں کے بڑے متحرک سکریٹری یا رکن ہیں۔ شیٹھی صاحب ذہن کے دیانت دار صحافی ہیں جنہیں اچھوتوں اور مسلمانوں کے مسائل سے خاص دلچسپی ہے۔ ان مسائل پر وہ اکثر قومی اخباروں اور موقر رسائل میں مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ چند دن پہلے مسلمانوں پر ایک مضمون کے سلسلے میں جو "دکن ہیرالڈ" میں چھپا تھا۔ شیٹھی صاحب نے ایک خط ایڈیٹر دی کے نرسمہن کے نام لکھا اس خط میں مسلمانوں کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے راج شیکھر شیٹھی نے ان زیادتیوں کا ذکر کیا تھا جو مسلمانوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ یہ خط اخبار میں نہیں چھپا۔ کچھ عرصے تک انتظار کرنے کے بعد شیٹھی صاحب نے ایڈیٹر نرسمہن سے اس سلسلے میں بات چیت کی۔ خط نہ چھاپنے کی نرسمہن نے یہ وجہ بتائی کہ انہیں شیٹھی کے نظریئے سے اختلاف ہے۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ ملازمتوں وغیرہ کے سلسلے میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہو رہی ہے۔ اور یہ کہ اس طرح کے خطوط یا مضامین شائع کرنے سے قومی اتحاد کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ نرسمہن کے کہنے کے مطابق مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں کوئی زیادتی نہیں ہو رہی ہے تو ایک صحافی ساتھی کا خط چھاپنے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو بالکل ناقابل قبول۔ بلکہ مبہم ہے۔ کہ اس قسم کا کوئی خط شائع کرنے سے قومی اتحاد کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ خط نہ شائع کرنے کی وجہ محض ایڈیٹر کا تعصب ہے۔ یاد رہے کہ نرسمہن پہلے

"انڈین اکسپریس" کے اور "ھندو" مدراس کے بھی ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ اگر ایسے بڑے انگریزی اخباروں کا یہ رویہ ہو تو ہندی اور چھوٹے موٹے اخباروں کا اس سے بہتر ہونے کی توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ سیٹھی نے جو خط "دکن ہیرالڈ" کو لکھا تھا اس میں باقاعدہ اعداد و شمار سے اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہے کہ بڑے بڑے قومی اخبار والے مسلمانوں کے مسائل کو حقیقت کی روشنی میں پیش کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایک طرف اس سے مسلمانوں کے مسائل کے متعلق صحیح رائے عامہ بن نہیں پاتی اور دوسری طرف حکومت پر ان مسائل کی طرف توجہ دینے کے لیے کوئی فوری دباؤ نہیں پڑتا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اردو اور مسلم اخباروں نے بھی اس سلسلے میں بہت صحت مند رویہ اختیار نہیں کیا ہے۔ یہ اخبار مسلم عوام خاص طور سے محنت کش کاریگر اور مفلسی کے خط سے نیچے رہنے والے دوسرے محنت کش مسلمانوں کے مسائل سے کم دلچسپی لیتے ہیں اور درمیانہ اور اوپری طبقے کے کلچرل اور لسانی مسائل سے زیادہ۔ عام طور پر اردو اخباروں میں مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں اردو، پرسنل لا اور علی گڈھ یونیورسٹی کے مسائل پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ مسائل اہم ہیں لیکن یہ کروڑوں محنت کش مسلم عوام کے مسائل نہیں ہیں۔ آج یہ بات سب جانتے ہیں کہ مسلمان عوام نسبتاً زیادہ غریب ہیں۔ لیکن ہمارے اردو اخباروں کے لیے ان کے مسائل زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ بنگال میں بائیں بازو والا محاذ جب اقتدار میں آیا تو کلکتہ کے ایک اردو اخبار نے اس کا اس لیے شکریہ ادا کیا کہ اس سال مسلمانوں کو عید الضحیٰ پر قربانی کے لیے آسانی سے اجازت دے دی گئی گویا یہ مسلمانوں کا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اور بائیں بازو کی حکومت سے مسلمانوں کے ایسے ہی مسائل حل کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

دوسری زبانوں کے قومی اخباروں کے ساتھ ساتھ اردو اخباروں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کے مسائل کو اپنے طبقاتی مفاد کی روشنی میں محض پرسنل لا، اردو علی گڈھ تک ہی محدود نہ کریں، بلکہ انھیں صحیح تناظر میں پیش کریں تاکہ مسلمانوں اور ان کے مسائل کے متعلق ملک میں متوازن اور صحت مند رائے عامہ قائم ہوسکے اور ایک طرف وہ موقع پرست مسلم لیڈر بے نقاب ہوں جو آج کل پرسنل لا، اور علی گڈھ یونیورسٹی کے نام کی روٹی کھا رہے ہیں اور دوسری طرف حکومت مسلم عوام کے مسائل پر فوری توجہ دینے کے لیے رائے عامہ کے دباؤ سے فوری قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے۔

(جون ۱۹۷۸)